أَفْضَلَكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرآنَ وَعَلَّمَهُ

"تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن حکیم سیکھے اور سکھائے" (صحیح بخاری)

جید قراء کرام کی آواز میں تلاوتِ قُرآن

مستند اُردو ترجمہ کے ساتھ تَفہیمِ قُرآن

ماہِ رمضان کی بابرکت ساعتوں میں اپنی سماعتوں کو تلاوتِ کلامِ مجید سے بہرہ ور کرنے کیلئے ریڈیو پاکستان کے ایف ایم چینل 93.4 "صوتُ القرآن" کو ٹیون کریں یا اپنے موبائل فون پر ریڈیو ایپ ریڈیو پاکستان آفیشل ڈاؤن لوڈ کرنے کے بعد لائیو سٹریم کے ذریعے اس چینل کی نشریات سُنیں

الحمدُللہ!

ملک کے ساٹھ شہروں اسلام آباد، لاہور، کوئٹہ، ملتان، فیصل آباد، نارووال، بہاولپور، حیدرآباد، خیرپور، مٹھی، گلگت، سکردو، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان، گوادر، سبی، میرپور، پشاور، کراچی اور دیگر شہروں میں "صوتُ القرآن" کی یہ نشریات 2015 سے جاری ہیں

اِن شاءاللہ

ریڈیو پاکستان، وزارتِ اطلاعات و نشریات
حکومتِ پاکستان

ماہنامہ

آہنگ

۱۹۴۸ء سے مسلسل اشاعت

اگست 2026ء

اداریہ

اگست کا مہینہ آتے ہی تاریخِ پاکستان کا وہ درخشاں باب نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے جب برصغیر کے مسلمانوں نے قائدِاعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں ایک آزاد وطن حاصل کیا۔ 14 اگست ہمیں صرف آزادی کی خوشی نہیں دیتا بلکہ اِس عظیم نعمت کی حفاظت، استحکام اور ترقی کے لیے اپنے عزم کی تجدید کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔اگست کا مہینہ آتے ہی وطنِ عزیز میں جشنِ آزادی کی تیاریاں اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہیں۔ سرکاری و عوامی سطح پر سبز ہلالی پرچموں کی بہار، قومی تقریبات اور ملی جذبے سے بھرپور سرگرمیاں اِس امر کی گواہی دیتی ہیں کہ 14 اگست کا دن آج بھی ہر پاکستانی کے دل میں آزادی کی قدر و منزلت کو تازہ کر دیتا ہے۔یہ دن ہمیں اُن لازوال قربانیوں کی یاد دلاتا ہے کہ جن کے نتیجے میں پاکستان ایک آزاد مملکت کی صورت میں دنیا کے نقشے پر اُبھرا۔اِس سال یومِ آزادی کا پیغام اِس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ پاکستان نے اپنی قومی سلامتی اور علاقائی امن کے لیے دوست اور برادر ممالک کے ساتھ تعاون کو مزید مستحکم کیا ہے۔ مکہ مشترکہ دفاعی معاہدہ باہمی اعتماد، دفاعی تعاون اور خطے میں امن و استحکام کے مشترکہ عزم کی علامت ہے۔

یومِ آزادی کے موقع پر ریڈیو پاکستان کا کردار ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ قیامِ پاکستان کی خبر دنیا تک پہنچانے والے اِس قومی نشریاتی ادارے نے ہر سال کی طرح اِس مرتبہ بھی خصوصی نشریات، قومی نغموں، تاریخی پروگراموں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کی نمائندہ آوازوں کے ذریعے آزادی کے جذبے کو اُجاگر کیا۔ ریڈیو پاکستان کی یہ کاوش دراصل قومی تاریخ کو محفوظ رکھنے اور نئی نسل تک آزادی کی جدوجہد اور اِس کے مقاصد پہنچانے کی ایک مؤثر روایت ہے۔

آج ضرورت اِس امر کی ہے کہ آزادی کے اِس جشن کو عزمِ عمل میں ڈھالا جائے۔ اتحاد، نظم و ضبط، محنت اور قومی ذمہ داری کے جذبے سے ہم اپنے وطن کو مزید مضبوط، مستحکم اور خوشحال بنا سکتے ہیں۔ پاکستان ہماری پہچان بھی ہے اور ہماری ذمہ داری بھی اور اِس ذمہ داری کی تکمیل ہی آزادی کا حقیقی جشن ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ وطنِ عزیز کو ہمیشہ اپنے حفظ وامان میں رکھے اور پاکستان کے پرچم کو ہر میدان میں سربلندی عطا فرمائے۔

(آمین)

سربراہِ اعلیٰ
اشفاق احمد خلیل

نگرانِ اعلیٰ
سعید احمد شیخ

نگران
مسرت شاہ رخ
عمران جاوید

مدیرِ اعلیٰ
افشاں نگار

مدیر
انیس الرحمٰن

کمپوزنگ
رابعہ شبیر احمد

گرافک ڈیزائننگ
عمران جوہر

قیمت: 500روپے

ماہنامہ آہنگ اگست 2026ء

☆عزمِ نو۔۔۔
مکہ مشترکہ دفاعی معاہدہ — رپورٹ: غضنفر عزیز — 3

☆مضامین۔۔۔۔
تصورِ دیانت — پروفیسر ذاکر حسین — 4
یوم الاقصیٰ — ڈاکٹر فواد علی — 5
یومِ شہادت میجر محمد طفیل شہید — آہنگ ڈیسک — 6
یومِ شہادت کیپٹن راشد منہاس شہید
یومِ استحصالِ کشمیر — عمران منور اعوان — 7
ڈاکٹر رُتھ فاؤ — تحریر: الطاف مجاہد — 9
جدید ذرائع ابلاغ اور ریڈیو کی اہمیت (بلوچستان کے تناظر میں) — عابد میر — 10
تحریکِ پاکستان میں خطۂ ملتان کا کردار — پروفیسر ڈاکٹر حمید رضا صدیقی — 11

☆دانش ور۔۔۔۔
بابائے اُردو مولوی عبدالحق — ڈاکٹر فرزانہ کوکب — 12

☆سخن ور۔۔۔۔
اب کے ہم بچھڑے (احمد فراز) — محسنہ بخاری — 13

☆فن اور فنکار۔۔۔۔
عمدہ بی بی اور نواب عنایت کوٹیا — تحریر: سعید احمد شیخ — 14
اختر حسین اکھیاں — محمد ظہیر بدر — 17
نصرت فتح علی خان — 19
ہم کو جگنوؤں کے تتلیوں کے دیس جانا ہے (نیرہ نور) — سجاد احمد بری — 21
نازیہ حسن — مقصود گوہر — 22

☆اُردو ادب۔۔۔۔
آواز (انشائیہ) — شاہد اللہ خان — 23
ایک دستر خوان اور تین قسم کے کھانے (افسانہ) — تحریر: نور محمد ترکئی — 25

☆ہم تو آواز ہیں۔۔۔۔
ریڈیو پاکستان چترال کی سالگرہ — جاوید اقبال جاوید — 26
ریڈیو پاکستان بہاولپور کی سالگرہ — فیض رسول ہاشمی — 27
ریڈیو پاکستان حیدر آباد، ثقافت اور شعور کا سفر — نعیمہ صدیق — 28
ایف ایم 101 حیدر آباد کی 24 بہاریں — نعیمہ صدیق — 29

☆تہذیب و ثقافت۔۔۔۔
پنیالہ، ایک سیاحتی مقام — ڈاکٹر الطاف احمد شاہ — 30
قلعہ منگلا، تاریخ، تہذیب اور ورثے کی لازوال داستان — علی اختر سلیم — 31
شیخ بدین، ڈیرہ اسماعیل خان کا ایک اہم سیاحتی مقام — ہمایوں رحمان — 32

☆سائنس اور ٹیکنالوجی۔۔۔۔
مصنوعی ذہانت اور سائبر سکیورٹی: ڈیجیٹل دور میں عام انسان کا تحفظ — تحریر: پروفیسر ڈاکٹر خالد محمد خان — 33

☆پوڈ کاسٹ۔۔۔۔
"گلوں میں رنگ بھرے" باغبانی کا شوق رکھنے والے مرغوب احمد عباسی سے خصوصی گفتگو — شریکِ گفتگو: فرخ ناز عینی، میمونہ شمیل حورانی — 35

☆بچوں کا آہنگ۔۔۔۔
جنگل کا شہزادہ — تحریر: تاج الدین تاجور — 39

مکہ مشترکہ دفاعی معاہدہ

رپورٹ: غضنفر عزیز

خادمِ حرمین شریفین جناب شاہ سلیمان بن عبدالعزیز آل سعود کی پُر وقار دعوت پر وزیراعظم پاکستان جناب محمد شہباز شریف اور جناب صدر رجب طیب اُردوان نے سعودی عرب کا دورہ کیا۔ سعودی ولی عہد جناب شہزادہ محمد بن سلیمان بن عبدالعزیز آل سعود نے مکہ مکرمہ میں واقع الصفا محل میں پاکستان کے وزیراعظم اور ترکیہ کے صدر کا استقبال کیا جہاں مشترکہ دفاع کے لیے سربراہی اجلاس منعقد ہوا۔ پاکستان، سعودی عرب اور ترکیہ نے جارحیت پر مبنی کسی بھی کاروائی کے خلاف اجتماعی دفاعی صلاحیت مضبوط بنانے کے عزم کے ساتھ مکہ مشترکہ دفاعی معاہدے پر دستخط کیے۔ اِس معاہدے پر سعودی ولی عہد جناب شہزادہ محمد بن سلیمان بن عبدالعزیز آل سعود، وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف اور ترکی کے صدر جناب رجب طیب اُردوان نے دستخط کیے۔ یہ معاہدہ تینوں ممالک کے اِس مشترکہ عزم کی عکاسی کرتا ہے کہ وہ اپنی اجتماعی سلامتی کو مزید مستحکم کریں گے اور ایک محفوظ اور خوشحال مستقبل کے حصول کے لیے خطے اور اس سے باہر اَمن، سلامتی اور استحکام کو فروغ دیں گے۔ معاہدے میں یہ طے پایا کہ تینوں ممالک میں سے کسی ایک کے خلاف بھی ہونے والے کسی بھی مسلح حملے کو اُن سب پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ اِس معاہدے میں تین ممالک کے درمیان دفاعی تعاون کے تمام پہلوؤں کو وسعت دینا اور بہتر بنانا بھی شامل ہے۔ سربراہی اجلاس کے دوران سعودی عرب، ترکی اور پاکستان کے درمیان خصوصی تعلقات کے ساتھ ساتھ باہمی دلچسپی کے متعدد امور کا جائزہ لیا گیا۔ وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف اور سعودی ولی عہد جناب شہزادہ محمد بن سلیمان بن عبدالعزیز آل سعود کے درمیان مکہ میں الصفا پیلس میں دوطرفہ ملاقات بھی ہوئی۔ ملاقات میں نائب وزیراعظم جناب محمد اسحاق ڈار، چیف آف آرمی اسٹاف اور چیف آف ڈیفنس فورسز فیلڈ مارشل جناب سید عاصم منیر اور وزیرِ دفاع جناب خواجہ محمد آصف وزیراعظم کے ہمراہ تھے۔ دریں اثناء وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے کہا کہ پاکستان، سعودی عرب اور ترکی مذہب، دوستی اور امن وسلامتی کے مشترکہ عزم کی بنیاد پر متحد ہیں۔ سوشل میڈیا پلیٹ فارم ایکس پر ایک پوسٹ میں اُنہوں نے کہا کہ اپنے عزیز بھائیوں سعودی ولی عہد جناب محمد بن سلیمان اور ترک صدر جناب رجب طیب اُردوان کے ہمراہ مکہ مشترکہ دفاعی معاہدے پر دستخط کرنا اُن کے لیے باعثِ اعزاز ہے۔ وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے دُعا کی کہ حرمین شریفین کے سائے میں طے پانے والا یہ تاریخی معاہدہ آئندہ نسلوں کے لیے امن کی ڈھال ثابت ہو اور تینوں برادر ممالک اور اُمتِ مسلمہ کے لیے خوشحالی کا باعث بنے۔ اُنہوں نے فیلڈ مارشل جناب سید عاصم منیر کو اُن کی انتھک کوششوں اور بھرپور لگن سے اِس عظیم مقصد کے حصول میں اہم کردار ادا کرنے پر سراہا۔

اُدھر سعودی وزیرِ خارجہ جناب شہزادہ فیصل بن فرحان نے اپنے بیان میں کہا کہ تینوں ممالک کا یہ معاہدہ اُن کے عوام کے اَمن، ترقی اور خوشحالی کے لیے ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اُنہوں نے ایکس پر ایک پوسٹ میں کہا کہ سعودی ولی عہد اور وزیراعظم جناب شہزادہ محمد بن سلیمان بن عبدالعزیز آل سعود، ترک صدر جناب رجب طیب اُردوان اور پاکستان کے وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف کی جانب سے معاہدے پر دستخط اُن کے درمیان دفاعی تعاون کے سفر میں ایک اہم سنگِ میل اور خطے کی سلامتی اور استحکام کو درپیش چیلنجز اور خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے مشترکہ کوششوں کو یکجا کرنے کی خواہش کا اظہار ہے۔

اسلامی تعاون تنظیم سمیت متعدد اسلامی ممالک نے پاکستان، سعودی عرب اور ترکیہ کے درمیان مکہ مشترکہ دفاعی معاہدے کا بھرپور خیر مقدم کیا۔ ترک صدر جناب رجب طیب اُردوان نے ایک بیان میں کہا کہ اجتماعی دفاع کی بنیاد پر طے پانے والے اِس معاہدے سے سلامتی اور دفاع سے متعلق مشترکہ منصوبوں میں تعاون مزید مضبوط ہوگا۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ معاہدہ کسی بھی ملک کے خلاف نہیں ہے اور امن واستحکام کے خواہش مند تمام برادر ممالک اِس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

ترک صدر جناب رجب طیب اُردوان نے کہا کہ اجتماعی دفاعی صلاحیت پر مبنی مکہ مکرمہ مشترکہ دفاعی معاہدہ سلامتی اور دفاعی تعاون کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوگا۔ اُنہوں نے ایکس پر ایک پوسٹ میں کہا کہ یہ معاہدہ دفاعی صنعت میں مشترکہ منصوبوں کی تیاری اور دہشتگردی کے خلاف جنگ میں بھی معاون ثابت ہوگا۔

اِسلامی تعاون تنظیم کے سیکرٹری جنرل جناب حسین ابراہیم طہ نے اِس اہم تزویراتی اقدام کا خیر مقدم کرتے ہوئے معاہدے کی مکمل حمایت کا اظہار کیا۔ او آئی سی (OIC) کے سیکرٹری جنرل نے معاہدے کو حتمی شکل دینے میں تینوں ممالک کی دانشمندانہ قیادت اور کوششوں کو بھی سراہا۔ بحرین کی وزارتِ خارجہ نے تینوں برادر ملکوں کی مضبوط دفاعی صلاحیتوں اور فوجی مہارت کو سراہا۔ دوسرے ملکوں کی طرح یمن نے بھی سعودی عرب، ترکیہ اور پاکستان کے درمیان مکہ مشترکہ دفاعی معاہدے کی بھرپور حمایت کا اعلان کیا۔ یمن کے وزارتِ خارجہ نے ایک بیان میں کہا کہ مکہ مشترکہ دفاعی معاہدہ تین ممالک کے درمیان دفاعی تعاون میں ایک اہم تزویراتی سنگِ میل ہے اور مشترکہ خطرات سے نمٹنے کے لیے اُن کی مشترکہ کوششوں کو ظاہر کرتا ہے۔ صومالیہ نے بھی پاکستان، سعودی عرب اور ترکیہ کے درمیان مکہ مشترکہ دفاعی معاہدے کا خیر مقدم کیا۔ صومالیہ کی وزارتِ دفاع نے ایک بیان میں کہا کہ یہ معاہدہ مشترکہ سیکیورٹی چیلنجز سے نمٹنے کے لیے قابلِ اعتماد دفاعی شراکت داری قائم کرے گا اور علاقائی امن، استحکام اور عالمی سلامتی کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کرے گا۔ مسجد الحرام اور مسجد نبوی ﷺ کے مذہبی امور کی صدارت کے سربراہ جناب شیخ پروفیسر ڈاکٹر عبدالرحمن بن عبدالعزیز السدیس نے بھی مکہ مشترکہ دفاع معاہدے کا خیر مقدم کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ مقدس شہر مکہ کے ماحول میں اِس معاہدے کا طے پانا خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

بشکریہ نیوز اینڈ کرنٹ افیئرز چینل

تصورِ دیانت

پروفیسر ذاکر حسین

سورہ نساء آیت نمبر 58 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اُن کے حقداروں کے حوالے کر دو۔'

ایک دوسری آیت کا ترجمہ ہے۔"ایمان والے وہ ہیں جو امانتوں کے اندر دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔"

حضرت انس بن مالک کی روایت شدہ حدیث کا مطلب ہے کہ جس میں امانت نہیں اُس کا کوئی ایمان نہیں۔ یعنی ایمان کی تکمیل کے لئے دیانت داری کا وصف بہت ہی اہم ہے۔ اِس کے بغیر ایمان کی حلاوت محسوس کرنا ناممکن ہے۔

آپس کے لین دین کے معاملات میں دیانت وامانت کی ضرورت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ جس معاشرے سے دیانت وامانت ختم ہو جائے اُسے بدترین معاشرہ تصور کیا جاتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کو بعثت سے پہلے ہی اہلِ مکہ کی جانب سے امین کا خطاب مل چکا تھا کیونکہ آپ ﷺ اپنے کاروبار اور معاملات میں انتہائی دیانت دار تھے۔ لوگ آپ ﷺ کے پاس امانتیں رکھتے تو آپ جُوں کے تُوں لوٹا دیتے۔ ہجرتِ مدینہ کے موقع پر آپ ﷺ نے اُن لوگوں کی امانتیں لوٹانے کا اہتمام فرمایا جو آپ کے قتل کے درپے تھے اور دشمنی کے باوجود اپنی امانتوں کے بارے میں صرف آپ ﷺ پر بھروسہ تھا۔

دیانت داری سے مراد کسی بھی شے اور کام کو اُس کے درست تقاضوں کے مطابق انجام دینا ہے۔ امانت ودیانت کا تعلق صرف مال سے نہیں بلکہ قرآن وسُنت میں اِس کا تصور نہایت وسیع ہے اور اِس کا تعلق زندگی کے ہر شعبے سے ہے۔ سب سے بڑی امانت داری اور دیانت داری انسان کا ربِ کائنات سے وہ عہد ہے جس کی پاسداری کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اِس کو دنیا میں بھیجا۔ اِس کی باقی تمام شاخیں اِسی تصور سے وابستہ ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بروقت ادائیگی اِسی میں شامل ہے۔ حضرت ابوسفیان سے جب روم کے بادشاہ ہرقل نے پوچھا کہ تمھارے اندر جو شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، وہ کن چیزوں کا حکم دیتا ہے۔ ابوسفیان نے جو ابھی مسلمان بھی نہ تھے، جواب دیا کہ آپ ﷺ ہمیں نماز، سچائی، پاک دامنی، ایفائے عہد، امانت داری اور دیانت داری کا حکم دیتے ہیں۔ تب ہرقل نے کہا کہ یہ باتیں نبی کی صفات ہی ہو سکتی ہیں۔ دیانت کا سلسلہ حُکمرانِ وقت سے شروع ہو کر ایک غلام اور خادم تک آتا ہے۔ حُکمران پر اپنے فرائض کی ادائیگی سمیت رعایا کی جان ومال اور عزت کی حفاظت کرنا، عدل قائم کرنا اور عہدہ ومنصب اہل اور دیانت دار لوگوں کے سپرد کرنا ہے۔ اِسی طرح علماء دینِ حق لوگوں کو پہنچانے کی امانت ادا کریں۔ مالدار اور اغنیاء اپنے اموال میں سے غرباء ومساکین کی معاونت کا فریضہ ادا کریں۔ سرکاری وغیر سرکاری ملازمین کا اپنی ڈیوٹی صحیح طور نبھانا اور فرائض میں کوتاہی نہ کرنا، اوقاتِ مقررہ کی پابندی کرنا دیانت داری کی صفت ہے۔ نبی کریم ﷺ امانت داری اور دیانت داری کا پیکر تھے۔ اِسی لئے کفار ومشرکین بھی آپ ﷺ کو صادق وامین کہہ کر پکارتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ قیامت کب آئے گی؟ فرمایا" جب امانتیں ضائع ہو کر بد دیانتی پھیل جائے تو تم قیامت کا انتظار کرنا۔ پوچھا گیا امانتیں کس طرح ضائع ہوں گی؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا 'جب عہدے نااہل لوگوں کے سپرد کئے جائیں گے۔" کیونکہ اِسی طرح نااہل لوگ اِس عہدے کا حق ادا نہیں کر سکیں گے اور اہل لوگ اپنے حقوق سے محروم رہیں گے جو کسی بھی معاشرے کا انسانیت سوز المیہ ہے۔ حضرت ابوحمید ساعدی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قبیلہ بنو اسد کے ایک شخص کو جن کا نام ابن اللُتبیہ تھا، قبیلہ بنو سُلیم کے صدقات وصول کرنے کے لئے عامل بنا کر بھیجا۔ وہ واپس آئے تو اُنہوں نے کچھ مال تو آنحضور ﷺ کے حوالے کر دیا اور کچھ مال یہ کہہ کر رکھ لیا کہ مجھے بطور ہدیہ اور تحفہ کے ملا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ خُوب اگر تم اپنے گھر میں بیٹھے رہتے تو پھر دیکھتے کہ کون آکر تمھیں یہ تحفے تحائف دیتا ہے۔ ابوحمید ساعدی کا بیان ہے کہ اُس کے بعد رسول اللہ ﷺ اُٹھ کھڑے ہوئے، پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی پھر فرمایا" جب میں تم میں سے کسی شخص کو تحصیل دار بنا کر بھیجتا ہوں تو وہ واپس آکر کہتا ہے کہ یہ آپ کا مال ہے اور یہ تحفے ہیں جو مجھے دیئے گئے ہیں اگر وہ سچ کہتا ہے تو کیوں اپنے ماں باپ کے گھر نہیں بیٹھتا۔ جہاں لوگ اُسے تحفے بھیجتے رہیں۔ خدا کی قسم جو شخص ناجائز طور پر کوئی چیز لے گا، قیامت کے دن اُسے اُٹھائے ہوئے دربارِ خداوندی میں حاضر ہوگا۔ میں تم میں سے اُن اشخاص کو پہچانوں گا جو ایک بڑبڑاتے ہوئے اونٹ یا آواز دینے والی گائے یا ممیاتی ہوئی بکری اٹھائے خدا کے سامنے پیش ہوں گے۔" پھر آپ ﷺ نے دونوں ہاتھ بلند کر کے فرمایا" یاالٰہی کیا میں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا"۔

بد دیانتی سے انسانی معاشروں میں بے اعتمادی اور انتشار جیسے منفی رجحانات فروغ پاتے ہیں اور انسان اشرف المخلوقات کے عظیم مرتبے سے نیچے گر کر جانوروں میں داخل ہونے کے ساتھ ساتھ جنت جیسی عظیم اور دائمی نعمت سے بھی محروم ہو جاتا ہے جو بڑی بدبختی ہے۔ جس جسم سے روح اِس حالت میں پرواز کر گئی کہ اُس انسان کے اندر تین چیزیں نہیں تھیں وہ جنت میں داخل ہوگا۔ یعنی وہ تکبر، خیانت اور قرض سے بری تھا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" جس نے تمھارے پاس امانت رکھی تمھارے اوپر لازم ہے کہ تم اُس کے ساتھ دیانت داری کا مظاہرہ کرو۔ اُس کو وہ مال وہ رقم وہ چیز اُسی طرح لوٹا دو۔ حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے جس نے تمھارے ساتھ خیانت کی تم اُس سے بھی خیانت نہیں کر سکتے۔

ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتے ہیں "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جن دو شریکوں کے درمیان کوئی معاملہ ہو۔ اُن دو شریکوں کے درمیان تیسرا میں نگہبان ہو جاتا ہوں۔ مددگار ہو جاتا ہوں جب تک اُن دونوں میں سے کوئی ایک امانت میں خیانت نہ کرے۔" جب تک وہ دونوں آپس میں مخلص امانت دار ہوتے ہیں، دیانت دار ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی نصرت اُن کے ساتھ ہوتی ہے۔ کوئی ایک بھی اُن میں سے خیانت کرے تو اللہ تعالیٰ اُن میں سے اپنی مدد اُٹھا لیتا ہے۔

جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دیانت دار سچا تاجر قیامت کے دن انبیائ، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ کتنی بڑی فضیلت والی بات ہے۔ تاجر ہے تجارت کرتا ہے۔ اپنے لئے کماتا ہے لیکن سچ بولتا ہے۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ خیانت نہیں کرتا۔ اپنے پیشے اور کاروبار میں دیانت داری سے کام لیتا ہے۔ اِسی دیانت داری کی وجہ سے روزِ محشر اتنا بلند مرتبہ پاتا ہے۔

روزمرہ کے لین دین، ناپ تول، مزدور کا اُجرت کے بدلے پورا کام، شوہر بیوی، اولاد، والدین، اُستاد، شاگرد وغیرہ کی حیثیت سے معاشرے کی طرف سے جو ذمہ داریاں ہم سب پر عائد ہوتی ہیں، اُن کو بطریقِ احسن سرانجام دینا دیانت داری کہلاتی ہے۔ امانت ودیانت تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی صفت رہی ہے۔ اُنہوں نے لوگوں کی امانتیں واپس کیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سونپی ذمہ داریاں پوری کیں۔ قبیلوں اور قوم کو حق کی راہ دِکھلائی۔ امانت داری اور دیانت داری ایمان کی نشانی ہے۔ بد دیانتی کی وجہ سے ہمیشہ کا بھروسہ ختم ہو جاتا ہے اور بدگمانی جنم لیتی ہے۔ بد دیانتی کو منافق کی نشانی قرار دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ مجالس امانت کے ساتھ ہیں۔ مجلس میں کی گئی باتوں کو اپنی ذات تک محدود رکھنا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے "امانت داری رزق کی چابی ہے۔ کسی شخص کے دعوؤں پر اعتبار نہ کرو۔ جب تک اُس میں دیانتداری اور امانت داری نہ دیکھو۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" کائنات کے بُرے لوگ وہ ہیں جو خائن ہیں جن میں دیانت داری نہیں۔" عمران ابنِ حسین سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا" لوگو! سب سے بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے۔ پھر میرے بعد جو زمانہ آئے گا۔ یعنی صحابہ کرام کا زمانہ۔ پھر جو اُن کے بعد زمانہ آئے گا۔ تابعین کا دور۔ پھر وہ جو خیانت کریں گے امانت داری، دیانت داری نہیں کریں گے اور خود گواہی دیں گے۔ لوگ اُن سے نہیں پوچھیں گے۔ یعنی لوگ اُن سے گواہی نہیں لیں گے اور وہ خود تیار ہوں گے۔ اور نذر مانتے ہیں اور نذر پوری نہیں کرتے۔"

آپ ﷺ نے فرمایا" خائن مرد اور خائن عورت کی گواہی قبول نہیں"۔ خیانت کرنا اور امانت ضائع کرنا قیامت کی نشانی ہے جب لوگ خائن کو امین اور امانت دار کو خائن کہیں گے۔

بشکریہ پی بی سی پشاور

یومُ الاقصیٰ

تحریر: ڈاکٹر فواد علی

دنیا کے نقشے پر کچھ خطے محض زمین کا ایک ٹکڑا نہیں ہوتے۔ وہ تاریخ کے زندہ اوراق، تہذیبوں کے سنگم، مذاہب کی یادگار اور قوموں کے اجتماعی حافظے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ فلسطین بھی ایسا ہی خطہ ہے؛ ایک ایسی سرزمین جس کی مٹی میں ہزاروں برس کی تاریخ سانس لیتی ہے، جس کے ذروں نے انبیائے کرام علیہم السلام کے قدموں کی چاپ سنی، جہاں تہذیبیں اُبھریں، سلطنتیں بنیں اور مٹ گئیں، مگر بیت المقدس کی عظمت آج بھی قائم ہے۔

فلسطین زرخیز ہلال، یعنی Fertile Crescent کا اہم حصہ رہا ہے۔ قدیم زمانے سے یہ خطہ مشرق و مغرب کے درمیان ایک اہم گزرگاہ اور عالمی سیاست کا مرکز رہا۔ فارس اور روم کے درمیان ہونے والی طویل جنگوں سے لے کر صلیبی جنگوں تک، اِس خطے کی اہمیت تاریخ کے ہر دور میں نمایاں رہی مگر فلسطین کی تاریخ میں انیسویں اور بیسویں صدی خاص اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ اِسی عرصے میں ایسے سیاسی فیصلے ہوئے جنہوں نے پورے خطے کا نقشہ بدل دیا۔

سلطنتِ عثمانیہ سے ایک نئے دور تک

انیسویں صدی کے اختتام تک فلسطین سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ تھا۔ یہاں عرب مسلمان اکثریت میں تھے، جبکہ عیسائی اور یہودی برادریاں بھی آباد تھیں۔ عثمانی دور میں یہ خطہ ایک انتظامی اور معاشرتی نظام کے تحت زندگی گزار رہا تھا۔ پھر یورپ میں صہیونی تحریک نے جنم لیا۔ تھیوڈور ہرزل کی قیادت میں 1897ء میں پہلی صہیونی کانگریس منعقد ہوئی اور فلسطین میں یہودی قومی وطن کے قیام کا تصور ایک منظم سیاسی تحریک کی شکل اختیار کرنے لگا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران برطانیہ نے فلسطین پر قبضہ کیا اور 2 نومبر 1917ء کو بلفور اعلامیہ جاری کیا، جس میں فلسطین میں یہودیوں کے لیے قومی وطن کے قیام کی حمایت کی گئی۔ یہ اعلان فلسطینی عرب آبادی کے لیے ایک نئے اضطراب کا آغاز تھا۔ آنے والی دہائیوں میں یہودی ہجرت اور آبادکاری میں اضافہ ہوا، فلسطینی مزاحمت بڑھی، اور 1936ء سے 1939ء تک فلسطینی بغاوت نے برطانوی اقتدار کو شدید چیلنج کیا۔ برطانوی حکومت نے اِس بغاوت کو طاقت کے ذریعے دبایا مگر مسئلہ حل نہ ہوا بلکہ آنے والے وقت کے لیے مزید پیچیدہ ہو گیا۔

1947ء: تقسیم کا فیصلہ

دوسری جنگِ عظیم کے بعد فلسطین کا مسئلہ عالمی سیاست کے ایوانوں میں پہنچا۔ 1947ء میں اقوامِ متحدہ نے فلسطین کو عرب اور یہودی ریاستوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی، جبکہ بیت المقدس کو بین الاقوامی انتظام کے تحت رکھنے کی بات کی گئی۔ یہ تجویز فلسطینی عرب قیادت اور عرب ممالک نے مسترد کر دی، جبکہ صہیونی قیادت نے اِسے قبول کر لیا۔ 14 مئی 1948ء کو اسرائیل کے قیام کا اعلان ہوا اور اُس کے فوراً بعد عرب اسرائیل جنگ شروع ہو گئی۔ اِس جنگ کے نتیجے میں بڑی تعداد میں فلسطینی اپنے گھروں سے بے دخل ہوئے۔ فلسطینی تاریخ میں یہ سانحہ نکبہ کے نام سے محفوظ ہے۔

پھر 1967ء کی چھ روزہ جنگ آئی، جس کے نتیجے میں اسرائیل نے مغربی کنارے، مشرقی یروشلم اور غزہ سمیت مزید فلسطینی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ یوں بیت المقدس اور مسجدِ اقصیٰ ایک ایسے تنازع کا مرکز بن گئے جو آج تک دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑ رہا ہے۔

اقصیٰ: ایک مسجد سے کہیں بڑھ کر

مسجدِ اقصیٰ مسلمانوں کے لیے محض ایک تاریخی عمارت نہیں۔ یہ قبلۂ اول ہے، انبیائے کرام علیہم السلام کی سرزمین ہے اور واقعۂ معراج کی عظیم نسبت اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ قرآنِ مجید فرماتا ہے:

سبحان الذِی سر بِعبدِہِ لیلا مِن المسجِدِ الحرامِ لِ المسجِدِ القص الذِی بارنا حولہ

یہ وہی مقام ہے جہاں رسولِ اکرم ﷺ تشریف لائے اور انبیائے کرام علیہم السلام کی امامت فرمائی۔ یہی نسبت مسجدِ اقصیٰ کو اُمتِ مسلمہ کے دل میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

اقصی ایک عمارت نہیں، ایک نسبت ہے؛

ایک جغرافیائی مقام نہیں، ایک روحانی یاد ہے؛

اور ایک تاریخی واقعہ نہیں، ایک زندہ احساس ہے۔

21 اگست: اقصیٰ کی آگ

21 اگست 1969ء کو مسجدِ اقصیٰ میں آتشزدگی کا المناک واقعہ پیش آیا۔ اِس واقعے نے پوری مُسلم دنیا کو شدید صدمے سے دوچار کیا۔ مسجد کے ایک حصے کو نقصان پہنچا، مگر اِس آگ نے مسلمانوں کے اجتماعی شعور میں ایک اور آگ روشن کر دی: اتحاد اور ذمہ داری کی آگ۔ اِسی سانحے کے بعد مُسلم ممالک کے درمیان باہمی تعاون کی ضرورت مزید شدت سے محسوس ہوئی اور اسلامی تعاون کی منظم کوششوں نے آگے چل کر اسلامی تعاون تنظیم کی صورت اختیار کی۔ اِس لیے 21 اگست محض ایک تاریخی واقعے کی یاد نہیں؛ یہ ہمیں اپنی ذمہ داری یاد دلانے والا دن بھی ہے۔

فلسطین ایک ماں کی آنکھ کا آنسو ہے۔

ایک باپ کی خاموش بے بسی ہے۔

ایک بچے کا اُجڑا ہوا گھر ہے۔

ایک بوڑھے کا وہ خواب ہے جس میں وہ اپنے آبائی گھر کے دروازے پر دوبارہ دستک دیتا ہے۔

7 اکتوبر 2023ء کے بعد غزہ میں جنگ نے ایک پہلے سے موجود انسانی بحران کو انتہائی سنگین بنا دیا۔ اسرائیل نے غزہ میں وسیع فوجی کارروائیاں شروع کیں۔ اِن کارروائیوں میں بڑی تعداد میں فلسطینی شہری جاں بحق ہوئے، جن میں بچے اور خواتین بھی شامل ہیں، جبکہ رہائشی علاقوں، طبّی مراکز، تعلیمی اداروں اور بنیادی ڈھانچے کی تباہی نے انسانی بحران کو مزید گہرا کر دیا۔

یوم الاقصیٰ ہمیں صرف ماضی یاد دلانے کے لیے نہیں آتا؛ یہ ہمیں اپنے حال سے سوال کرنے کے لیے آتا ہے۔ ہم اپنی نئی نسل کو فلسطین کی تاریخ بتائیں۔ انہیں مسجدِ اقصیٰ کی نسبت سمجھائیں۔ اُنہیں یہ سکھائیں کہ مظلوم کی حمایت کا مطلب صرف جذباتی نعرہ نہیں بلکہ علم، شعور، اخلاق، انسانی ہمدردی اور پُرامن جدوجہد بھی ہے۔ تاریخ کی راتیں کتنی ہی طویل کیوں نہ ہوں، صبح کا امکان کبھی ختم نہیں ہوتا۔ مسجدِ اقصیٰ کے صحن میں آج بھی اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔ فلسطینی نسلیں آج بھی اپنے بچوں کو اقصیٰ کی محبت منتقل کرتی ہیں۔ دنیا بھر کے مسلمان آج بھی بیت المقدس کا نام سنتے ہیں تو دل میں ایک کسک محسوس کرتے ہیں۔ یہی کسک اِس زندہ نسبت کی دلیل ہے۔

بشکریہ پی بی سی ڈیرہ اسماعیل خان

pbcaahanghqrs@gmail.com
Monthly Ahang

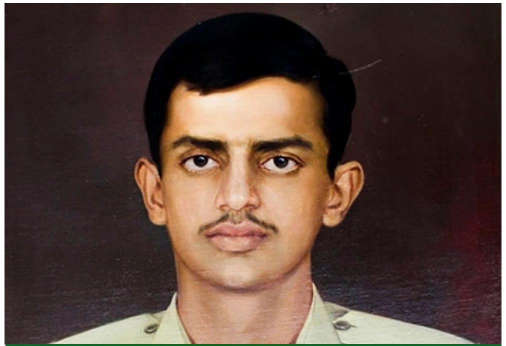

پائلٹ آفیسر راشد منہاس

پائلٹ آفیسر راشد منہاس ایک پاکستانی فائٹر پائلٹ تھے اور پاکستان کے اعلیٰ ترین فوجی اعزاز نشانِ حیدر کے پانچویں وصول کنندہ تھے۔ منہاس پاکستان فضائیہ کے پہلے اور واحد افسر تھے جنہوں نے نشانِ حیدر حاصل کیا اور یہ اعزاز حاصل کرنے والے سب سے کم عمر افسر بھی تھے۔ اگست 1971ء میں معمول کے تربیتی مشن کے دوران منہاس نے اپنے جیٹ ٹرینر پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کی جب اُن کے اعلیٰ افسر فلائٹ لیفٹیننٹ مطیع الرحمان نے بنگلہ دیش کی جنگِ آزادی میں شامل ہونے کے لیے طیارے کا کنٹرول سنبھال لیا لیکن منہاس نے طیارے کو کنٹرول کرنے کی کوششوں میں مزاحمت کی اور اُسے پاکستان کے ضلع سجاول میں گرا کر تباہ کر دیا۔

راشد منہاس کراچی میں پیدا ہوئے۔ منہاس راجپوت گوت گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ 1968ء میں سینٹ پیٹرک اسکول کراچی سے سینئر کیمبرج کیا۔ خاندان کے متعدد افراد پاکستان کی بری، بحری اور فضائی افواج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اُنہوں نے بھی اپنا آئیڈیل فوجی زندگی کو بنایا اور اپنے ماموں ونگ کمانڈر سعید سے جذباتی وابستگی کی بناء پر فضائیہ کا انتخاب کیا۔ تربیت کے لیے پہلے کوہاٹ اور پھر پاکستان ائیر فورس اکیڈمی رسالپور بھیجے گئے۔ فروری 1971ء میں پشاور یونیورسٹی سے انگریزی، ائیر فورس لائ، ملٹری ہسٹری، الیکٹرونکس، موسمیات، جہاز رانی، ہوائی حرکیات وغیرہ میں بی۔ ایس۔ سی کیا۔ بعدازاں تربیت کے لیے کراچی بھیجے گئے اور اگست 1971ء میں پائلٹ آفیسر بنے۔

20 اگست 1971ء کو راشد کی تیسری تنہا پرواز تھی۔ وہ ٹریز جیٹ طیارے میں سوار ہوئے ہی تھے کہ اُن کا انسٹرکٹر سیفٹی فلائٹ آفیسر مطیع الرحمان خطرے کا سگنل دے کر کاک پٹ میں داخل ہو گیا اور طیارے کا رخ بھارت کی سرحد کی طرف موڑ دیا۔ راشد نے ماڑی پور کنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم کیا تو اُنہیں ہدایت کی گئی کہ طیارے کو ہر قیمت پر اغوا ہونے سے بچایا جائے۔ اگلے پانچ منٹ راشد اور غدار انسٹرکٹر کے درمیان طیارے کے کنٹرول کے حصول کی کشمکش میں گذرے مطیع الرحمان نے راشد منہاس سے طیارے کا کنٹرول حاصل کرنے کی پوری کوشش کی لیکن راشد منہاس نے اُس کو ناکام بنا دیا۔ مطیع الرحمان کی تجربہ کاری کی بناء پر جب راشد منہاس نے محسوس کیا کہ طیارے کو کسی محفوظ جگہ پر لینڈ کرانا ممکن نہیں تو اُنہوں نے آخری حربے کے طور پر جہاز کا رخ زمین کی طرف موڑ دیا اور طیارہ زمین سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا جس کے نتیجے میں راشد منہاس اور مطیع الرحمان دونوں وفات پا گئے لیکن ایک نے قابلِ رشک موت یعنی شہادت کا درجہ پایا اور تاریخ میں اپنا نام امر کر لیا جبکہ دوسرا غدار کہلایا۔ راشد منہاس کے اِس عظیم کارنامے کے صلے میں اُنہیں سب سے بڑا فوجی اعزاز نشانِ حیدر دیا گیا۔

میجر طفیل محمد شہید

میجر طفیل محمد شہید (1914ء تا 7 اگست 1958ئ) پاکستان کے صوبہ پنجاب میں ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق گجر برادری سے ہے۔ میجر طفیل محمد نے 1943ء میں 16 پنجاب رجمنٹ میں کمیشنڈ حاصل کیا۔ اپنی بٹالین کے علاوہ شہری مسلح فورسز میں مختلف کمانڈ اور تدریسی تقرریوں پر مشتمل ایک امتیازی کیریئر کے بعد اُنہیں 1958ء میں کمپنی کمانڈر کی حیثیت سے مشرقی پاکستان رائفلز میں تعینات کر دیا گیا۔

اگست 1958ء کی ابتداء میں اُنہیں چند بھارتی دستوں کا صفایا کرنے کا مشن سونپا گیا جو لکشمی پور میں مورچہ بند تھے۔ اُنہوں نے رات کے وقت ایک بے خطا مارچ مکمل کیا اور 7 اگست کو بھارتی چوکی کو گھیرے میں لے لیا۔ اپنے ساتھیوں کی قیادت کرتے ہوئے دشمن سے 15 گز کے فاصلے پر پہنچ کر اُنہوں نے عقب سے حملہ آور پارٹی کی قیادت کی۔ جب بھارتیوں نے مشین گن سے فائر شروع کیے تو میجر طفیل اُس کا نشانہ بننے والے پہلے سپاہی تھے۔ بے تحاشہ خون بہنے کی حالت میں اُنہوں نے ایک گرینیڈ پھینک کر دشمن کی مشین گن کو خاموش کر دیا۔ اُن کی زندگی کا چراغ رفتہ رفتہ دھیما پڑ رہا تھا مگر اُنہوں نے آپریشن کی ہدایات دینا جاری رکھا۔ جب دشمن کی دوسری مشین گن نے فائرنگ شروع کی تو میجر طفیل کے سیکنڈ ان کمانڈ اُس کا نشانہ بن گئے۔ میجر طفیل نے ایک نہایت پختہ نشانے کے حامل گرینیڈ کے ذریعے اُس گن کو بھی تباہ کر دیا۔ دوبدو ہاتھا پائی کے دوران میجر طفیل نے دیکھا کہ بھارتی چوکی کا کمانڈر خاموشی سے اُن کے ایک جوان پر حملہ آور ہونے والا تھا۔ باوجود شدید زخمی ہونے کے میجر طفیل رینگتے ہوئے دشمن کمانڈر کے پاس پہنچ گئے اور اپنی ایک ٹانگ پھیلا دی۔ جیسے ہی دشمن ٹھوکر کھا کر گرا، میجر طفیل نے اپنے اسٹیل ہیلمٹ سے اُس کے چہرے پر ضربیں لگا کر اپنے جوان کو بچا لیا۔ میجر طفیل نے اپنے دستے کی قیادت جاری رکھی یہاں تک کہ بھارتی اپنے پیچھے چار لاشیں اور تین قیدی چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ اردلی اور حوالدار انہیں اسٹریچر پر اُٹھا کر خیمے میں لے گئے۔ خصوصی ریل کے ذریعے سی ایم ایچ کومیلا میں پیٹ کا آپریشن کر کے 4 گولیاں برآمد کی گئیں۔ گولیاں نکالنے کے بعد ٹانکے لگانے کے دوران شہید ہو گئے اور اُنہیں پاکستان کا اعلیٰ ترین فوجی اعزاز نشانِ حیدر عطا کیا گیا۔ میجر طفیل کے نام کی مناسبت سے گگو منڈی کے قریب ایک گاؤں کا نام طفیل آباد رکھا گیا۔ اُن کی تدفین چک 253 ای بی میں کی گئی۔

آہنگ ڈیسک

یومِ استحصالِ کشمیر

کشمیریوں کے حقِ خودارادیت کی جدوجہد کا عزمِ نو

تحریر : عمران منور اعوان

کشمیر برف پوش پہاڑوں، سرسبز وادیوں، شفاف جھیلوں، بہتے چشموں اور دل آویز مناظر کی سرزمین۔ قدرت نے اِس خطے کو بے مثال حُسن سے نوازا ہے، مگر اِس حُسن کے پردے میں ایک ایسی داستان بھی پوشیدہ ہے جس کے صفحات گزشتہ کئی دہائیوں سے قربانی، صبر، استقامت اور جدوجہد سے رقم ہو رہے ہیں۔ مقبوضہ جموں و کشمیر کے عوام اپنے بنیادی انسانی اور سیاسی حقوق کے حصول اور اپنے مستقبل کے تعین کے لیے ایک طویل جدوجہد سے گزر رہے ہیں۔ اِسی جدوجہد کی یاد تازہ کرنے اور کشمیری عوام کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کے لیے پاکستان ہر سال 5 اگست کو یومِ استحصالِ کشمیر مناتا ہے۔ 5 اگست 2019ء مقبوضہ جموں و کشمیر کی تاریخ کا ایک نہایت اہم اور فیصلہ کن دِن تھا۔ اُس روز بھارتی حکومت نے اپنے آئینی اقدامات کے ذریعے مقبوضہ جموں و کشمیر کی سابقہ آئینی حیثیت میں بنیادی تبدیلیاں کیں اور ریاست کو دو انتظامی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اِن اقدامات کے بعد مقبوضہ علاقے میں سخت پابندیاں عائد کی گئیں، مواصلاتی ذرائع محدود کیے گئے اور معمولاتِ زندگی شدید متاثر ہوئے۔ یومِ استحصال اِسی پسِ منظر میں کشمیری عوام کے ساتھ اظہارِ یکجہتی، اُن کے بنیادی حقوق کی حمایت اور مسئلۂ کشمیر کے منصفانہ حل کے عزم کی علامت بن چکا ہے۔

کشمیر کی تاریخی حیثیت

مسئلۂ کشمیر جنوبی ایشیاء کی تاریخ کا ایک اہم اور حساس باب ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت ریاست جموں و کشمیر ایک مسلم اکثریتی ریاست تھی۔ تقسیمِ ہند کے بعد اِس خطے کے مستقبل کا مسئلہ پیدا ہوا اور اِس کے نتیجے میں ایک ایسے تنازعے نے جنم لیا جو آج تک خطے کے امن و استحکام کو متاثر کر رہا ہے۔ پاکستان کا اصولی مؤقف ہمیشہ یہ رہا ہے کہ کشمیری عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی متعدد قراردادوں میں بھی مسئلۂ کشمیر کے حل اور کشمیری عوام کے حقِ خودارادیت کے اصول کو زیرِ بحث لایا گیا۔ پاکستان عالمی برادری سے مسلسل مطالبہ کرتا رہا ہے کہ کشمیری عوام کی خواہشات اور بنیادی حقوق کو سامنے رکھتے ہوئے اِس دیرینہ تنازع کا منصفانہ اور پائیدار حل تلاش کیا جائے۔

کشمیر کا مسئلہ محض زمین کے ایک ٹکڑے کا تنازع نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کے مستقبل، اُن کے بنیادی حقوق، شناخت اور سیاسی خواہشات سے وابستہ معاملہ ہے۔ اِسی لیے اِس مسئلے کا حل طاقت کے استعمال کے بجائے انصاف، مکالمے، عالمی اصولوں اور کشمیری عوام کی اُمنگوں کی روشنی میں تلاش کیا جانا ضروری ہے۔

5 اگست 2019؛ ایک نئے دور کا آغاز

5 اگست 2019ء کو بھارتی حکومت کی جانب سے کیے گئے اقدامات نے مقبوضہ جموں و کشمیر کی سیاسی اور انتظامی صورتِ حال میں بڑی تبدیلی پیدا کی۔ اِن اقدامات کے بعد طویل عرصے تک مواصلاتی پابندیاں نافذ رہیں، سیاسی سرگرمیاں محدود ہوئیں اور بڑی تعداد میں کشمیری سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کو حراست کا سامنا کرنا پڑا۔ یومِ استحصالِ کشمیر اِسی دن کی یاد دلاتا ہے کہ کسی بھی خطے کے عوام کو اُن کے بنیادی حقوق سے محروم کر کے دیرپا امن قائم نہیں کیا جا سکتا۔ امن صرف خاموشی کا نام نہیں، حقیقی امن انصاف، مساوات، آزادیِ اظہار، انسانی وقار اور بنیادی حقوق کے احترام سے جنم لیتا ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں رہنے والے عوام کے لیے یہ دن صرف احتجاج کا دن نہیں بلکہ اپنے حق کے لیے عزم کی تجدید کا دن بھی ہے۔ پاکستان کے لیے یہ دن اِس امر کا اظہار ہے کہ وہ کشمیری عوام کے جائز حقِ خودارادیت کی اخلاقی، سیاسی اور سفارتی حمایت جاری رکھے گا۔

کشمیری عوام کی استقامت

کشمیر کی تاریخ قربانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ کئی نسلوں نے نامساعد حالات کے باوجود اپنے سیاسی مستقبل کے حق کے لیے آواز بلند کی۔ کشمیری عوام نے مشکلات، پابندیوں اور آزمائشوں کے باوجود اپنی شناخت اور اپنے سیاسی مؤقف کو زندہ رکھا۔ اِس جدوجہد کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اِس نے کشمیری معاشرے میں صبر، استقامت اور اُمید کے جذبات کو مضبوط کیا۔ ماں نے اپنے بیٹوں کی جدائی برداشت کی، نوجوانوں نے اپنے مستقبل کے بارے میں بے یقینی کے باوجود

اُمید کا دامن تھامے رکھا اور خاندانوں نے مشکل حالات میں بھی اپنی زندگی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ کسی بھی قوم کی اصل قوت صرف اِس کے وسائل میں نہیں ہوتی بلکہ اِس کے حوصلے، شعور اور اجتماعی عزم میں ہوتی ہے۔ کشمیری عوام کی جدوجہد بھی اِسی اجتماعی عزم کی عکاس ہے۔

انسانی حقوق کا پہلو

مسئلۂ کشمیر کا ایک اہم پہلو انسانی حقوق کا ہے۔ پاکستان مسلسل اِس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ مقبوضہ جموں و کشمیر میں انسانی حقوق کا احترام کیا جائے اور شہریوں کو بنیادی آزادیوں اور تحفظ کا حق دیا جائے۔ دنیا میں انسانی حقوق کے عالمی اصول اِس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ کسی بھی خطے کے عوام کے بنیادی انسانی وقار کا احترام کیا جائے۔ آزادیٔ اظہار، مذہبی آزادی، پُرامن اجتماع، سیاسی سرگرمی اور زندگی و سلامتی کا تحفظ ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ اِسی لیے کشمیر کے مسئلے کو صرف جغرافیائی تناظر میں دیکھنا کافی نہیں۔ اِس کے انسانی پہلو کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ کشمیری ماؤں، بہنوں، بچوں اور نوجوانوں کے احساسات اور مشکلات بھی اِس مسئلے کا بنیادی حصہ ہیں۔

پاکستان کا مؤقف

پاکستان نے ہمیشہ مسئلۂ کشمیر کے پُرامن، منصفانہ اور اصولی حل کی حمایت کی ہے۔ پاکستان کی سیاسی قیادت، پارلیمان، میڈیا، سول سوسائٹی اور عوام نے ہر سطح پر کشمیری عوام کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا ہے۔ یومِ استحصالِ کشمیر کے موقع پر پاکستان نہ صرف کشمیری عوام کو یہ پیغام دیتا ہے کہ وہ اُن کی جدوجہد میں اُن کے ساتھ کھڑا ہے بلکہ عالمی برادری کی توجہ بھی اِس دیرینہ مسئلے کی طرف مبذول کراتا ہے۔ پاکستان کا مؤقف واضح ہے کہ جنوبی ایشیاء میں پائیدار امن اور استحکام کے لیے مسئلۂ کشمیر کا منصفانہ حل ناگزیر ہے۔ خطے کے کروڑوں عوام امن، ترقی اور خوش حالی کے خواہاں ہیں۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ تنازعات کو مذاکرات، سفارت کاری اور باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے حل کیا جائے۔

نوجوان نسل اور مسئلۂ کشمیر

آج کی دنیا معلومات اور ابلاغ کی دنیا ہے۔ نوجوان نسل دنیا کے کسی بھی حصے میں رونما ہونے والے واقعات سے لمحوں میں آگاہ ہو جاتی ہے۔ اِس لیے نئی نسل کو مسئلۂ کشمیر کی تاریخ، اِس کے قانونی و سیاسی پہلو اور کشمیری عوام کی جدوجہد سے آگاہ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ پاکستانی نوجوانوں کے لیے کشمیر محض نصابی موضوع نہیں بلکہ قومی احساس اور انسانی ہمدردی کا معاملہ ہے۔ اُنہیں یہ سمجھنا ہوگا کہ کشمیری عوام کی حمایت کا مطلب صرف نعروں تک محدود رہنا نہیں بلکہ علم، تحقیق، ذمہ دارانہ ابلاغ اور مثبت سفارت کاری کے ذریعے مسئلے کو دنیا کے سامنے اُجاگر کرنا بھی ہے۔ سوشل میڈیا کے اِس دور میں نوجوان کشمیر کے بارے میں مستند معلومات دنیا تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ تاہم اِس کے لیے ضروری ہے کہ معلومات کی صحت، زبان کی شائستگی اور اظہار کی ذمہ داری کو ہمیشہ مقدم رکھا جائے۔

کشمیر اور پاکستانی قوم کا رشتہ

کشمیر کے ساتھ پاکستان کا تعلق جغرافیائی ہی نہیں بلکہ تاریخی، تہذیبی اور جذباتی بھی ہے۔ دونوں اطراف کے عوام کے درمیان صدیوں پر محیط مذہبی، ثقافتی اور خاندانی روابط موجود رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی عوام کشمیریوں کی مشکلات کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں۔ یومِ استحصالِ کشمیر پاکستانی قوم کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ کشمیری بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ اپنی یکجہتی کا اظہار کرے اور دنیا کو یہ پیغام دے کہ مسئلۂ کشمیر کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستانی قوم کی یہ یکجہتی کسی قوم یا ملک سے دشمنی کی بنیاد پر نہیں بلکہ انصاف، امن اور انسانی حقوق کے اصولوں پر قائم ہے۔ پاکستان خطے میں امن کا خواہاں ہے اور سمجھتا ہے کہ دیرپا امن اُسی وقت ممکن ہے جب تمام فریق ایک دوسرے کے جائز مؤقف کو سنیں اور تنازعات کے حل کے لیے سنجیدہ کوشش کریں۔

عالمی برادری کی ذمہ داری

مسئلہ کشمیر کئی دہائیوں سے عالمی توجہ کا منتظر ہے۔ اقوامِ متحدہ اور عالمی طاقتوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جنوبی ایشیاء کے اِس دیرینہ تنازع کو محض ایک علاقائی مسئلہ سمجھ کر نظرانداز نہ کریں۔ دنیا نے مختلف خطوں میں تنازعات کے حل کے لیے مذاکرات، ثالثی اور سفارتی کوششوں کے ذریعے راستے تلاش کیے ہیں۔ کشمیر کے معاملے میں بھی ایسی ہی سنجیدہ اور بامعنی کوششوں کی ضرورت ہے۔ عالمی برادری کو چاہیے کہ وہ انسانی حقوق کے عالمی اصولوں کی پاسداری کو یقینی بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کرے اور پاکستان اور بھارت کے درمیان بامعنی مذاکرات کی حوصلہ افزائی کرے۔ اِس عمل میں کشمیری عوام کی خواہشات اور اُمنگوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔

کشمیر؛ امن کی طرف ایک راستہ

کشمیر کا مسئلہ جنگ نہیں بلکہ امن، مکالمے اور انصاف کا تقاضا کرتا ہے۔ جنوبی ایشیاء ایک ایسا خطہ ہے جہاں کروڑوں انسان اپنے بہتر مستقبل کے لیے کوشاں ہیں۔ اُنہیں غربت، بے روزگاری، تعلیم، صحت، ماحولیاتی تبدیلی اور معاشی ترقی جیسے مسائل کا سامنا ہے۔ خطے کے وسائل تنازعات کے بجائے انسانی ترقی پر صرف ہوں تو پورا جنوبی ایشیاء ترقی کی نئی منزلیں طے کر سکتا ہے۔ کشمیر میں پائیدار امن پورے خطے کے لیے خوش حالی کا دروازہ کھول سکتا ہے۔ تجارت، سیاحت، ثقافتی روابط اور عوامی سطح پر تعلقات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اِس لیے مسئلۂ کشمیر کا پُرامن حل صرف کشمیری عوام ہی نہیں بلکہ پورے خطے کے مفاد میں ہے۔

عزمِ نو

یومِ استحصالِ کشمیر ہر سال ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ تاریخ کے بعض ابواب وقت گزرنے سے فراموش نہیں ہوتے۔ کشمیر بھی ایسا ہی ایک باب ہے۔ اِس مسئلے کی حساسیت، کشمیری عوام کی قربانیاں اور خطے کے امن سے اِس کا تعلق اِسے مسلسل عالمی توجہ کا مستحق بناتا ہے۔ 5 اگست کا دن ہمیں کشمیری عوام کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کے ساتھ ساتھ اپنے قومی عزم کی تجدید کا موقع دیتا ہے۔ یہ عہد کہ پاکستان کشمیری عوام کے جائز حقِ خودارادیت کی حمایت جاری رکھے گا، مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر اُجاگر کرتا رہے گا اور خطے میں پائیدار امن کے لیے پُرامن اور سفارتی کوششوں کی حوصلہ افزائی کرے گا۔ کشمیر کی وادی آج بھی دنیا کو یہ پیغام دیتی ہے کہ اُمید زندہ ہو تو مشکل سے مشکل دور بھی گزر جاتا ہے۔ برف سے ڈھکے پہاڑوں کے درمیان بہتے چشموں کی طرح کشمیری عوام کی اُمید بھی جاری ہے۔ اُن کی جدوجہد اِس یقین سے وابستہ ہے کہ انصاف کی منزل دیر سے سہی، مگر بالآخر راستہ ضرور بناتی ہے۔ یومِ استحصالِ کشمیر دراصل اِسی اُمید، اِسی عزم اور اِسی جدوجہد کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا دن ہے۔ یہ دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ صرف ماضی کی داستان نہیں بلکہ حال کی ذمہ داری اور مستقبل کا سوال بھی ہے۔ آج ضرورت اِس امر کی ہے کہ مسئلۂ کشمیر کو جذبات کے ساتھ ساتھ تدبر، تحقیق، سفارت کاری اور مؤثر ابلاغ کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ کشمیری عوام کے بنیادی حقوق اور اُن کی جائز خواہشات کو عالمی سطح پر اُجاگر کیا جائے اور جنوبی ایشیا میں ایسا ماحول پیدا کیا جائے جہاں اختلافات کا حل طاقت نہیں بلکہ مذاکرات اور انصاف کے ذریعے ممکن ہو۔ کشمیر کے سرسبز میدان، برف پوش پہاڑ اور خاموش جھیلیں آج بھی امن کی منتظر ہیں۔ اِن وادیوں میں گونجتی دعائیں ایک ایسے مستقبل کی خواہاں ہیں جہاں خوف کی جگہ اطمینان، بے یقینی کی جگہ اُمید اور کشمکش کی جگہ امن ہو۔ یومِ استحصالِ کشمیر کا پیغام یہی ہے کہ کشمیری عوام کی آواز کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے بنیادی حقوق، اُن کی شناخت اور اُن کے مستقبل سے وابستہ سوال کو انصاف اور اصولوں کی روشنی میں حل کرنا ہی جنوبی ایشیا کے پائیدار امن کی جانب ایک اہم قدم ہے۔ کشمیر کی صبحِ آزادی اور امن کی اُمید آج بھی زندہ ہے اور یہی اُمید اِس جدوجہد کا سب سے روشن چراغ ہے۔

بشکریہ ایف ایم 101 اسلام آباد

مادام رُتھ فاؤ: انسانیت کی خدمت کی روشن مثال اور پاکستان کو جذام سے نجات دلانے والی عظیم خاتون

تحریر: الطاف مجاہد

سنہ تھا2002ء اور مارچ کے اخری ایام جب شاخوں پر شگوفے کھلتے اور غنچے چٹختے ہیں، میں ریگل کراچی کے میری ایڈ لپروسی سینٹر کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ اپنے عہد کی نامور خاتون سے ملاقات کا شرف حاصل کرسکوں جن پر ہر پاکستانی فخر کرتا ہے، ایک دو بار گو کہ اُن سے ملاقات رہی تھی مگر سرسری سی لیکن لمحوں کی ملاقات میں بھی اُن کے پُرنور چہرے، انکسار سے لبریز لہجے نے مجھ سمیت ہر ملاقاتی کو ہمیشہ متاثر ہی کیا تھا۔ مجھے کہنے دیجئے کہ وہ سراپا محبت تھیں اور زمین پر فرشتوں کا عکس۔ کوڑھی یا جذامی جنہیں کوئی پاس بٹھانا پسند نہ کرے وہ اُن کی مرہم پٹی کرتی تھیں حوصلہ بڑھاتی تھیں۔ سیڑھیاں ختم ہوئیں تو سامنے استقبالیہ پر وہ خود موجود تھیں اور ایک مریض سے محوِ گفتگو۔
جی ہاں تذکرہ مقصود ہے مادام رُتھ فاؤ کا جو پاکستان کی تاریخ میں خدمتِ انسانیت، بے لوث محبت اور عزم و حوصلے کا پیکر ہونے کے ناطے ایسی روشن مثال جن کا ذکر ہمیشہ احترام اور عقیدت سے کیا جاتا رہے گا۔
وہ جرمنی میں پیدا ہوئیں، لیکن اپنی زندگی کا بڑا حصہ پاکستان کے اُن لوگوں کے لیے وقف کردیا جنہیں معاشرے میں جذام، یعنی Leprosy کے باعث نفرت، خوف اور سماجی تنہائی کا سامنا تھا۔ اُنہوں نے صرف ایک بیماری کے خلاف جنگ نہیں لڑی بلکہ اُن لوگوں کے لیے آواز بلند کی جنہیں معاشرے نے نظرانداز کردیا تھا۔ مادام رُتھ فاؤ 9 ستمبر 1929ء کو جرمنی کے شہر لائپزگ میں پیدا ہوئیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے تباہ کن حالات نے اُن کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ جنگ کے بعد اُنہوں نے طب اور انسانیت کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ وہ مذہبی خدمت کے ایک ادارے سے وابستہ ہوئیں اور اِسی سلسلے میں 1960ء میں پاکستان پہنچیں۔ کراچی آمد کے بعد جب اُنہوں نے یہاں جذام کے مریضوں کی حالت دیکھی تو اُن کا دل دہل گیا۔ بہت سے مریض علاج اور مناسب سہولیات سے محروم تھے جبکہ بیماری کے بارے میں غلط تصورات کی وجہ سے اُنہیں معاشرے سے دور رکھا جاتا تھا۔
اُس وقت جذام کو ایک انتہائی خوفناک اور لاعلاج بیماری سمجھا جاتا تھا۔ مریضوں کو نہ صرف جسمانی تکلیف برداشت کرنا پڑتی تھی بلکہ اُنہیں سماجی نفرت، تنہائی اور امتیازی سلوک کا بھی سامنا تھا۔
مادام رُتھ فاؤ نے اِس صورتحال کو چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُنہوں نے کراچی سٹی اسٹیشن کی ریلوے کالونی سے ملحقہ جذامیوں کی بستی میں جذام کے مریضوں کے لیے ایک چھوٹے سے مرکز سے اپنے مشن کا آغاز کیا جو آگے چل کر میری ایڈی لیڈ لپروسی سینٹر (MALC) کی بنیاد بنا۔ یہ ادارہ پاکستان میں جذام کے خلاف جدوجہد کے ایک اہم مرکز کے طور پر دنیا بھر میں پہچانا جاتا ہے۔
مادام رُتھ فاؤ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اُنہوں نے جذام کے علاج کو صرف ایک طبّی مسئلہ نہیں سمجھا بلکہ اِسے انسانی وقار اور معاشرتی ذمہ داری کا مسئلہ بھی قرار دیا۔ وہ مریضوں کے درمیان جاتیں، اُن کا علاج کرتیں، اُن کی حوصلہ افزائی کرتیں اور اُنہیں احساس دلاتیں کہ وہ معاشرے پر بوجھ نہیں بلکہ برابر کے انسان ہیں۔ اُن کا طرزِ عمل اُس دور کے سماجی رویوں کے بالکل برعکس تھا۔
اُنہوں نے پاکستان کے مختلف علاقوں میں جذام کے علاج اور تشخیص کے مراکز قائم کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کی۔ دور دراز علاقوں میں طبّی عملے کی تربیت، مریضوں کی تشخیص، ادویات کی فراہمی اور بیماری سے متعلق آگاہی اُن کے مشن کا اہم حصہ تھا۔
اُن کی کوششوں سے جذام کے علاج کا ایک مربوط نظام تشکیل پانے میں مدد ملی۔ اُنہوں نے حکومت، طبّی ماہرین، سماجی کارکنوں اور عالمی اداروں کے ساتھ مل کر اِس بیماری کے خلاف ایک منظم حکمتِ عملی کو فروغ دیا۔
مادام رُتھ فاؤ نے عوام میں یہ شعور اُجاگر کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا کہ جذام کوئی ایسی بیماری نہیں جس کی وجہ سے مریض کو معاشرے سے کاٹ دیا جائے۔ جدید علاج کی مدد سے اِس بیماری کا مؤثر علاج ممکن ہے، اور اگر مریض کی بروقت تشخیص علاج کیا جائے تو بیماری کے پھیلاؤ اور پیچیدگیوں کو بڑی حد تک روکا جاسکتا ہے۔ اِس آگاہی مہم نے جذام کے بارے میں پائی جانے والی بہت سی غلط فہمیوں کو ختم کرنے میں مدد دی۔
پاکستان میں جذام کے خلاف جدوجہد میں مادام رُتھ فاؤ کی خدمات کا اندازہ اِس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کے کام نے ملک کے صحت کے نظام میں اِس بیماری کو باقاعدہ توجہ کا مرکز بنانے میں مدد دی۔ اُن کی مسلسل کوششوں اور دیگر طبّی و حکومتی اداروں کی کاوشوں کے نتیجے میں پاکستان نے عالمی سطح پر جذام کے خاتمے کے حوالے سے نمایاں پیش رفت کی۔ 1996ء میں عالمی ادارہ صحت نے پاکستان کو جذام کے حوالے سے قابو پانے کے مطلوبہ معیار تک پہنچنے والے ممالک میں شمار کیا۔ یہ کامیابی مادام رُتھ فاؤ اور اُن کی ٹیم کی کئی دہائیوں پر محیط بھرپور محنت کا ایک اہم ثمر تھی۔
مادام رُتھ فاؤ آج ہمارے درمیان موجود نہیں، لیکن اُن کی خدمات، اُن کا مشن اور اُن کی انسان دوست سوچ زندہ ہے۔ پاکستان کو جذام کے خلاف مؤثر جدوجہد کی راہ پر گامزن کرنے میں اُن کا کردار تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اُن کی زندگی ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ معاشرے کے سب سے کمزور اور محروم انسان کا ہاتھ تھامنا ہی دراصل انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

بشکریہ پی بی سی کراچی

جدید ذرائع ابلاغ اور ریڈیو کی اہمیت (بلوچستان کے تناظر میں)

تحریر:۔ عابد میر

ہم جانتے ہیں کہ انسان نے جب اپنے احساسات، تجربات اور خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کی ضرورت محسوس کی تو ابلاغ کے مختلف ذرائع وجود میں آئے، لیکن اکیسویں صدی میں ذرائع ابلاغ نے جس وسعت اور اثرپذیری کے ساتھ انسانی زندگی کو اپنے حصار میں لیا ہے، وہ ماضی کی کسی بھی صدی کا تصور نہیں تھا۔ ماضی کی کسی بھی صدی میں اِس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آج دنیا ایک عالمی گاؤں کی صورت اختیار کرچکی ہے جہاں فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ خبریں لمحوں میں ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پہنچ جاتی ہیں اور رائے سازی کا عمل پہلے سے کہیں زیادہ تیز اور پیچیدہ ہو گیا ہے۔ تاہم اگر بلوچستان جیسے وسیع، دشوار گزار اور جغرافیائی اعتبار سے منفرد خطے کی بات کی جائے تو یہاں جدید ذرائع ابلاغ کی اہمیت محض معلومات کی ترسیل تک محدود نہیں رہتی بلکہ یہ تعلیم، ثقافت، سماجی بیداری، قومی ہم آہنگی اور مقامی شناخت کے تحفظ کا ایک مؤثر وسیلہ بھی بن جاتی ہے۔
بلوچستان اپنی وسیع و عریض زمین، بلند و بالا پہاڑی سلسلوں، طویل ساحلی پٹی، صحراؤں، دُورافتادہ بستیوں اور مختلف زبانوں و ثقافتوں کی وجہ سے پاکستان کا ایک منفرد صوبہ ہے۔ یہاں ایسے بے شمار علاقے ہیں جہاں آج بھی جدید شہری سہولیات مکمل طور پر دستیاب نہیں، لیکن ذرائع ابلاغ نے اِن دوریوں کو کسی حد تک کم کردیا ہے۔ موبائل فون، انٹرنیٹ، سوشل میڈیا، ٹیلی ویژن اور اخبارات نے ایک نئی دنیا کے دروازے کھولے ہیں، مگر اِن سب کے درمیان ریڈیو اب بھی اپنی سادگی، رسائی اور اعتماد کی وجہ سے ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ بلوچستان کے اِن دور دراز علاقوں میں جہاں انٹرنیٹ کی رفتار کم ہوجاتی ہے یا بجلی کی فراہمی غیریقینی ہوتی ہے، وہاں ریڈیو کی آواز آج بھی کسی قریبی دوست کی مانند لوگوں کے ساتھ رہتی ہے۔
یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید ذرائع ابلاغ نے بلوچستان کے نوجوانوں کو ملک اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات سے آگاہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج گوادر کے ساحل سے لے کر مکران کے پہاڑوں تک اور ژوب کے میدانوں سے لے کر چاغی کے صحراؤں تک نوجوان اپنے موبائل فون کے ذریعے دنیا بھر کی معلومات تک رسائی رکھتے ہیں۔ وہ تعلیم، کاروبار، ادب، سائنس اور ٹیکنالوجی کے نئے رجحانات سے واقف ہو رہے ہیں اور اپنے خیالات کو عالمی سطح پر پیش کرنے کے مواقع حاصل کر رہے ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا نے بلوچستان کے نوجوان لکھنے والوں، شاعروں، فن کاروں اور سماجی کارکنوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم فراہم کیا ہے جہاں وہ اپنی زبان، اپنی ثقافت اور اپنے مسائل کو دنیا کے سامنے لا سکتے ہیں۔
تاہم بلوچستان کے مقامی تناظر میں اگر کسی ذریعے نے سب سے زیادہ مستقل اور دیرپا خدمات انجام دی ہیں تو وہ ریڈیو ہے۔ ریڈیو کی نشریات نے نہ صرف معلومات کی فراہمی کو آسان بنایا بلکہ مختلف مقامی زبانوں کو بھی فروغ دیا۔ بلوچی، براہوی، پشتو، ہزارگی اور دیگر زبانوں میں نشر ہونے والے پروگراموں نے لوگوں کو اپنی تہذیبی جڑوں سے وابستہ رکھا۔ جب کسی دُور افتادہ گاؤں میں شام اُترتی ہے، پہاڑوں پر خاموشی چھا جاتی ہے اور سمندر کی لہریں گوادر کے ساحل سے ٹکراتی ہیں تو ریڈیو کی آواز صرف خبر نہیں سناتی بلکہ لوگوں کے احساسات، اُن کی زبان اور اُن کی یادوں کو بھی زندہ رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچستان کے بزرگ آج بھی ریڈیو کو محض ایک آلہ نہیں بلکہ اپنی روزمرہ مجلس کے ایک اہم ساتھی کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں بھی ریڈیو اور دیگر جدید ذرائع ابلاغ نے بلوچستان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ایسے علاقوں میں جہاں تعلیمی ادارے محدود ہیں یا اساتذہ کی کمی کا سامنا ہے، وہاں تعلیمی پروگراموں اور آن لائن ذرائع نے طلبہ کے لیے نئے امکانات پیدا کیے ہیں۔ خصوصاً وبائی دور کے بعد یہ حقیقت مزید واضح ہوگئی کہ جدید ذرائع ابلاغ تعلیم کو گھروں تک پہنچانے کی غیرمعمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر اِن وسائل کو مقامی زبانوں اور مقامی ضروریات کے مطابق مزید فروغ دیا جائے تو بلوچستان کے دُورافتادہ علاقوں میں تعلیمی انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔
اِسی طرح ہنگامی حالات میں ریڈیو کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ سیلاب، زلزلے یا دیگر قدرتی آفات کے دوران جب مواصلات کے دوسرے ذرائع متاثر ہو جائیں تو ریڈیو لوگوں تک بروقت اطلاعات پہنچانے کا ایک مؤثر ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ بلوچستان جیسے وسیع اور بعض اوقات دشوار گزار خطے میں یہ خصوصیت ریڈیو کو ایک غیرمعمولی اہمیت عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کے بے شمار ذرائع سامنے آنے کے باوجود ریڈیو اپنی افادیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جدید ذرائع ابلاغ کے استعمال میں احتیاط اور ذمہ داری کو پیش نظر رکھا جائے کیونکہ معلومات کی فراوانی کے اِس دور میں غلط خبریں، افواہیں اور غیرمصدقہ اطلاعات بھی تیزی سے پھیلتی ہیں۔ بلوچستان جیسے حساس اور متنوع معاشرے میں ذرائع ابلاغ کا کردار محض خبررسانی تک محدود نہیں بلکہ سماجی ہم آہنگی، برداشت اور مثبت سوچ کے فروغ سے بھی وابستہ ہے۔ اِس لیے ضروری ہے کہ میڈیا مقامی ثقافت، روایات اور زبانوں کے احترام کو مقدم رکھے اور معاشرے میں تعمیری کردار ادا کرے۔ الغرض، جدید ذرائع ابلاغ اور خصوصاً ریڈیو بلوچستان کے لیے محض معلومات کی ترسیل کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک ایسا پُل ہیں جو دُور دراز بستیوں کو ایک دوسرے سے، مقامی ثقافت کو جدید دنیا سے اور ماضی کی روایات کو مستقبل کی نئی اُمیدوں سے جوڑتا ہے۔ بلوچستان کی مٹی، اِس کے پہاڑ، اِس کے ساحل اور اِس کے لوگ آج بھی اپنی شناخت کے ساتھ آگے بڑھنے کا خواب دیکھتے ہیں اور اِس خواب کی تعبیر میں جدید ذرائع ابلاغ اور ریڈیو کا کردار آنے والے وقت میں مزید اہم اور مؤثر ہوتا جائے گا۔ البتہ بلوچستان کے مقامی حالات کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ جدید ذرائع ابلاغ کی تمام تر ترقی کے باوجود صوبے کے ایک بڑے حصے میں آج بھی بجلی کی فراہمی مسلسل اور یقینی نہیں جبکہ متعدد دُورافتادہ علاقوں میں انٹرنیٹ یا تو موجود ہی نہیں یا اِس کی رفتار اِس قدر کم ہے کہ اِس سے مؤثر استفادہ ممکن نہیں ہو پاتا۔ مکران کے دُور دراز دیہات، رخشان ڈویژن کے وسیع علاقوں، چاغی کے صحرائی خطوں اور پہاڑی بستیوں میں آج بھی لوگ جدید ڈیجیٹل دنیا سے مکمل طور پر جڑ نہیں سکے۔ ایسے میں اگر کوئی ذریعہ اپنی سادگی، کم خرچ ہونے اور آسان رسائی کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائے ہوئے ہے تو وہ ریڈیو ہے جو بیٹری کے چند سیلوں پر چلتے ہوئے اُن گھروں تک بھی خبریں، معلومات اور تفریح پہنچا دیتا ہے جہاں بجلی کے کھمبے ابھی تک نہیں پہنچ سکے۔ یہ بلوچستان کی ایک منفرد سماجی حقیقت ہے کہ یہاں جدید ذرائع ابلاغ کی افادیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن اُن کی رسائی ابھی تک یکساں نہیں ہوسکی۔ ایک طرف گوادر، کوئٹہ اور چند دیگر شہری مراکز میں نوجوان سوشل میڈیا، آن لائن تعلیم اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز سے جڑے ہوئے ہیں تو دوسری طرف بے شمار بستیاں ایسی بھی ہیں جہاں شام ڈھلتے ہی اندھیرا اُتر آتا ہے اور دنیا سے رابطے کا واحد قابلِ اعتماد ذریعہ ریڈیو رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیو بلوچستان میں محض ایک روایتی ذریعہ ابلاغ نہیں بلکہ زندگی کی ضرورت کے طور پر اپنی افادیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ یہ موسم کی خبر دیتا ہے، زرعی معلومات پہنچاتا ہے، مقامی زبانوں میں پروگرام نشر کرتا ہے اور دُورافتادہ آبادیوں کو قومی اور عالمی حالات سے جوڑے رکھتا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ جہاں جدید ذرائع ابلاغ نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کیا ہے، وہاں بلوچستان کے دشوار گزار جغرافیے بنیادی سہولیات کی کمی نے ریڈیو کو آج بھی ایک زندہ، مؤثر اور عوامی ذریعہ ابلاغ کے طور پر محفوظ رکھا ہوا ہے۔ ریڈیو کی یہ اہمیت محض ماضی کی یادگار نہیں بلکہ بلوچستان کی زمینی حقیقتوں سے جنم لینے والی ایک ایسی ضرورت ہے جو آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ اِس سارے پسِ منظر میں، کہا جاسکتا ہے کہ ریڈیو اگر بلوچستان کے عوام کے دلوں میں اپنی جگہ مزید مضبوط کرنا چاہتا ہے تو اِسے صرف خبروں کا وسیلہ بننے کے بجائے اِس سرزمین کی دھڑکن بننا ہوگا۔ اِسے چاہیے کہ وہ مکران کے ماہی گیروں کے خوابوں کو اپنی نشریات میں جگہ دے، رخشان کے چرواہوں کی تنہائیوں کو آواز بخشے، چاغی کے صحراؤں میں اُڑتی گرد کے ساتھ سفر کرے اور کوہِ سلیمان کے دامن میں بسنے والے لوگوں کے دُکھ سکھ کو اپنی کہانی بنائے۔ اسے بلوچی، براہوی، پشتو اور ہزارگی میں صرف پروگرام نہیں بلکہ لوگوں کے دلوں کی بات سنانی ہوگی، اُن کے لوک گیت، اُن کی محبت کی داستانیں، اُن کے مسائل، اُن کی اُمیدیں اور اُن کی روزمرہ جدوجہد کو اِس انداز سے پیش کرنا ہوگا کہ سامع کو محسوس ہو کہ یہ آواز کسی دُور دراز اسٹوڈیو سے نہیں بلکہ اُسی کی بستی، اُسی کے آنگن اور اُسی کے دل سے اُٹھ رہی ہے۔

بشکریہ پی بی سی کوئٹہ

تحریکِ آزادی میں خطۂ ملتان کا کردار

تحریر: پروفیسر ڈاکٹر حمید رضا صدیقی (ماہرِ تعلیم)

برصغیر میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے اور مسلمانوں کے لئے علیحدہ ریاست کے قیام کے لئے جو تحریک چلائی گئی اُس میں ملک کے دوسرے حصوں کے عوام کی مانند خطۂ ملتان کے عوام نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا آغاز تحریکِ خلافت کے زمانے میں ہوا۔ ملتان میں اِس تحریک کو عروج اُس وقت ملا جب سید زین العابدین گیلانی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر عوامی تحریک میں شامل ہوئے۔ وہ انتہائی مستعد اور متحرک شخصیت تھے۔ تحریکِ خلافت میں اُنہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ وہ ایک ہفتہ وار جریدہ "ترجمان" کے نام سے بھی نکالتے تھے۔ اُنہوں نے 1931ء میں اپنی ایک علیحدہ تنظیم "انجمن فدایانِ اسلام" قائم کی تھی جس کے وہ صدر تھے۔ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے اُنہوں نے عملی طور پر بہت کام کیا۔ مسجد شہید گنج کی بازیابی کی تحریک میں اُن کا اہم کردار رہا۔ وہ اِس تحریک میں گرفتار بھی ہوئے۔ اِس تحریک کی قیادت مولانا ظفر علی خان کر رہے تھے۔ اِس تحریک میں گرفتار ہونے والے کارکنوں کی رہائی قائداعظم محمد علی جناح کی کوششوں سے ہوئی۔ ایک محفل میں بطور خاص زین العابدین گیلانی کا تعارف قائداعظمؒ سے کراتے ہوئے مولانا ظفر علی خان نے انہیں عظیم مجاہد قرار دیا۔ قائداعظمؒ نے اُن کے سیاسی کردار کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ "مسلمانوں کو اپنی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بنانے کی بجائے مسلم لیگ کو تقویت پہنچانی چاہیے۔" قائداعظمؒ نے انہیں مسلم لیگ میں شمولیت اور اِس کی تنظیم نو کرنے دعوت دی۔ قائداعظمؒ کی پیشکش پر اُنہوں نے اپنی دو نظمیں "انجمن اتحادِ ملت" اور "انجمن فدایانِ اسلام" کو ختم کر کے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ اِس سے ملتان میں مسلم لیگ کو بڑی تقویت ملی۔ 1939ء کی بات ہے انہیں مسلم لیگ ضلع ملتان کا صدر بنا دیا گیا اور دیگر بہت سارے لوگ جو اُن کے ساتھ تھے وہ بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے جس سے اِس خطے میں مسلم لیگ کو مستحکم ہونے کا موقع ملا۔

آل انڈیا مسلم لیگ اگرچہ دسمبر 1906ء میں ڈھاکہ میں قائم ہوئی تھی لیکن ملتان کے خطے میں جاگیرداری نظام، تعلیم کی کمی اور دیگر وجوہات کی بناء پر مسلم لیگ کا قیام فوری طور پر اِس کے وجود میں آنے کے بعد نہ ہو سکا اور ملتان میں اِس کی بنیاد طویل عرصے کے بعد 1936ء کے آخر میں رکھی گئی اور اِس کی سرگرمیاں برائے نام تھیں۔ اِسی لئے مسلم لیگ میں جان اُس وقت پڑی جب قائداعظمؒ کے مشورے پر سید زین العابدین گیلانی نے اپنی قائم کردہ تنظیموں کو توڑ کر مسلم لیگ میں ضم کر دیا اور وہ خود اور اُن کے ساتھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اُنہوں نے مسلم لیگ کی تنظیم کے لئے دن رات ایک کر دیا۔

23 مارچ 1940ء کو حصولِ پاکستان کے لئے جب قراردادِ لاہور منظور کی گئی تو ملتان کے مسلم لیگی کارکنوں کا ایک وفد سید زین العابدین کی قیادت میں اِس میں شریک ہوا۔ اِس وفد میں مخدوم سید علمدار حسین، سید علی حسن گردیزی، خواجہ عبدالکریم قاصف، محمد بخش کپتان، غلام رسول پاکستان اور سید سعید احمد شاہ بخاری بھی شامل تھے۔ اُس زمانے میں ملتان کے بڑے بڑے جاگیردار، زمیندار اور بڑے بڑے سیاسی خانوادوں کے لوگ مسلم لیگ کے ساتھ نہیں تھے۔ غریب مگر مخلص کارکنوں نے مسلم لیگ کا پیغام گلی گلی پہنچایا۔ اِن کارکنوں میں ربنواز مخلص بھی تھے جو ٹین ساز تھے۔ غلام رسول معمولی زرگر تھے۔ اِن لوگوں نے اپنا کاروبار اور خاندانی پیشہ ترک کر کے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا۔ اِس طرح ملک امیر بخش قصاب، واحد بخش کھڈی والا، بابا کرم دین، خدا بخش، الٰہی بخش، غازی محمد صدیق مسلم لیگ کے پُرجوش مخلص کارکن تھے۔ بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار یونینسٹ پارٹی یا کانگرس میں تھے۔ غریب مگر مخلص کارکنوں نے قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔

خطۂ ملتان میں قیامِ پاکستان کے لئے زیادہ کام 1945ء سے شروع ہوا۔ 1945-46ء کے انتخابات نے مسلمانوں کی جدوجہد کو تیزی بخش دی۔ اُس دور میں مسلم طلبہ بھی مسلم لیگی کارکنوں کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ اُس زمانے میں ملتان میں صرف ایک کالج ایمرسن کالج تھا جو 1920ء میں قائم ہوا تھا۔ اُس کے پہلے پرنسپل مسٹر ٹام لنسن تھے جبکہ اُس کے بعد میاں محمد ابراہیم پرنسپل بنے۔ وہ پہلے مسلمان پرنسپل تھے اور 22 سال سے زائد عرصے تک اِس ادارے کے سربراہ رہے۔ اُن کے دور میں مسلم طلبہ نے تحریکِ پاکستان کے جلسے جلوسوں میں حصہ لیا۔ پروفیسر گوہر علی شاہ کالج میں جغرافیے کے لیکچرار تھے اور علی گڑھ کالج کے فارغ التحصیل تھے۔ اُنہوں نے مسلم طلبہ کو منظم کیا۔ 1945-46ء کے انتخابات میں یہاں کے طلبہ نے ملتان کے دیہی اور نواحی علاقوں میں مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔ اُس دور کے نمایاں طلبہ میں شیخ ریاض پرویز، سید قاسم شاہ، فیض علی شاہ، عاشق نواز بابر، پیرزادہ حیدر علی، سعید احمد شاہ بخاری، سردار محمد عظیم سدوزئی، صاحبزادہ فاروق علی خان، صاحبزادہ رؤف علی خان، احمد خان درانی، ارشد چوہدری، ملک محمد یار اور بہت سے دیگر طلبہ رہنما تھے جنہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور انتخابات میں مسلم لیگی ورکرز کی حیثیت سے اہم کردار ادا کیا۔ 1945-46ء کے انتخابات میں ملتان کے حلقے سے اگرچہ مسلم لیگی اُمیدوار ملک محمد اکرم بوسن کامیاب نہ ہو سکے تاہم شجاع آباد کے حلقے سے مسلم لیگ کے حاجی محمد رمضان شاہ گیلانی اور لودھراں کے حلقے سے غلام مصطفی شاہ گیلانی، کبیر والا سے سید نوبہار شاہ اور بہت سے دیگر اُمیدوار کامیاب ہوئے۔ ملتان اور ڈیرہ غازی خان کی صرف تین نشستوں پر یونینسٹ کے نمائندے کامیاب ہوئے باقی تمام نشستیں مسلم لیگ کے اُمیدواروں نے جیت لیں۔

جب 1947ء میں پنجاب میں یونینسٹ وزیراعلیٰ خضر حیات ٹوانہ کی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک چلائی گئی تو ملتان کے مسلم لیگی کارکنوں نے مسلسل احتجاجی جلوس نکال کر تحریک کو زندہ رکھا۔ اِس تحریک میں بے شمار مسلم لیگی کارکنوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ اُن میں عبدالستار حامد، گل حمید، عاشق نواز خان بابر، غلام نبی شاہ گیلانی، سید ولائت حسین گیلانی، سید صاحب علی شاہ گردیزی، مخدوم محمد سجاد حسین قریشی، سید زین العابدین گیلانی اور بے شمار دوسرے رہنما اور کارکن شامل تھے۔

پاکستان جب دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا تو 15 اگست 1947ء کو مسلم لیگی کارکن سرکاری تقریبات میں شریک ہونے کی بجائے مسلم لیگی رہنما سید زین العابدین گیلانی کی قیادت میں سب سے پہلے اندرون بوھڑ گیٹ کی جامع مسجد، اندرون پاک گیٹ کی مسجد، مسجد ولی محمد خان چوک بازار، جامع مسجد دہلی گیٹ گئے جہاں اُنہوں نے اِن مساجد پر قومی پرچم لہرایا۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے دستے نے سلامی دی اور اذان دی گئی۔

یہ وہ مساجد تھیں جو ہندو اکثریتی علاقوں میں گھری ہوئی تھیں اور یہاں سے اللہ اکبر کی صدائیں بلند کرنا بے حد مشکل بلکہ ناممکن بنا دیا گیا تھا اور تقریباً ایک صدی تک ہندو تعصب کا شکار رہنے کے بعد سبز ہلالی پرچم اُن پر لہرا رہا تھا اور اذان کی صدائیں بلند ہو رہی تھی۔ بعد میں اِسی طرح سرکاری دفاتر اور تعلیمی اداروں پر پاکستانی پرچم لہرائے گئے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ خطۂ ملتان میں مسلمانوں کی علیحدہ وطن کی تحریک اگرچہ بہت تاخیر سے چلائی گئی تاہم اِس میں بڑے بڑے سیاسی خاندانوں کی بجائے عام لوگوں اور سیاسی کارکنوں نے بھرپور حصہ لیا۔ اِس طرح اِس خطے میں پاکستان کے قیام کا راستہ ہموار ہو سکا۔ جاگیرداری، پسماندگی اور غربت کے چنگل میں گرفتار لاکھوں لوگوں کو آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملا۔

بشکریہ پی بی سی ملتان

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی علمی، ادبی اور لسانی خدمات

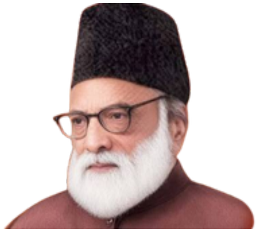

تحریر: ڈاکٹر فرزانہ کوکب

ڈاکٹر مولوی عبدالحق، جنہیں "بابائے اُردو" کہا جاتا ہے، 20 اپریل 1870ء کو ہندوستان کے ضلع میرٹھ (ہاپڑ) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شمار اُردو زبان کے عظیم محققین میں ہوتا ہے جنہوں نے اُردو کی بقائ، فروغ اور معیار سازی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ اُنہیں بجا طور پر "بابائے اُردو" کہا جاتا ہے کیونکہ اُن کی خدمات صرف تصنیف و تالیف تک محدود نہیں بلکہ اُنہوں نے اُردو زبان کی تدریس، قواعد، لغت نویسی، تحقیق، تنقید، تدوینِ متون، ادارہ سازی اور قومی زبان کی تحریک میں بھی غیر معمولی کردار ادا کیا۔ اُن کی علمی کاوشوں کے نتیجے میں اُردو زبان کو ایک مضبوط تحقیقی بنیاد اور ادارہ کو استحکام حاصل ہوا۔ مولوی عبدالحق کا تعلق علی گڑھ تحریک سے تھا۔ اُنہوں نے سرسید احمد خان کے تعلیمی و فکری مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے اُردو کو جدید علوم کی زبان بنانے کی کوشش کی۔ اُن کی شخصیت میں محقق، نقاد، ماہرِ لسانیات، معلم، مدیر اور منتظم کی تمام صفات موجود تھیں۔ مولوی عبدالحق کی سب سے بڑی خدمت اُردو زبان کا فروغ ہے. بابائے اُردو کے بقول: "زبان کسی قوم کی تہذیب، تمدن اور قومی شعور کی آئینہ دار ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں: "مولوی عبدالحق کی شخصیت اپنی ذات میں ایک انجمن تھی۔ اُنہوں نے اُردو کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔

مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اُردو کو فعال بنایا اور اُسے اُردو زبان و ادب کی سب سے مؤثر علمی تنظیم میں تبدیل کر دیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد کراچی منتقل ہو کر بھی اُنہوں نے اِس ادارے کو زندہ رکھا اور پاکستان میں اُردو کے فروغ کے لیے مسلسل کام کیا۔ مولوی عبدالحق نے کلاسیکی ادب کی متعدد کتابوں کی تدوین کی جن میں خصوصاً انتخابِ کلامِ میر اور انتخابِ داغ قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کے تحقیقی مقدمات آج بھی اُردو تحقیق کا اہم سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر رشید حسن خان لکھتے ہیں: "مولوی عبدالحق کی تدوین میں متن کی صحت، حوالوں کی درستی اور تاریخی شعور نمایاں نظر آتا ہے۔"

مولوی عبدالحق نے اُردو قواعد، املاء، صرف و نحو اور لُغت نویسی پر نمایاں کام کیا۔ اُنہوں نے زبان کی سادگی، معیار اور صحت پر ہمیشہ زور دیا اور اُردو کو جدید علمی زبان بنانے کی کوشش کی۔ اُن کی لسانی خدمات نے بعد کے محققین کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کی۔ مولوی عبدالحق نے اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ اُنہوں نے نصابی کتابوں کی تیاری، علمی مجلات کی اشاعت اور اُردو میں جدید علوم کے فروغ کے لیے مسلسل جدوجہد کی۔ مولوی عبدالحق نے اُردو تحقیق کے دائرہ کو مذہب اور تاریخ سے نکال کر لسانی اور ادبی تحقیق تک وسعت دی۔ دُکن میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام اور اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں آپ کا کلیدی کردار رہا۔ آپ نے متعدد لُغات (ڈکشنریوں)، قدیم متون اور ادبی شہ پاروں کی تدوین تالیف کی۔

اُردو کالج کراچی (موجودہ وفاقی اُردو یونیورسٹی کی بنیاد) کے قیام میں بھی اُن کا بنیادی کردار تھا۔

اُن کی تنقید تاثراتی نہیں بلکہ تحقیقی نوعیت کی ہے۔ وہ کسی بھی ادبی متن کے تاریخی، لسانی اور فنی پہلوؤں کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں۔ اُن کی تنقید میں اعتدال، دلیل اور علمی دیانت نمایاں ہے۔ مولوی عبدالحق اُردو خاکہ نگاری کی ارتقاء میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور اُن کا مجموعہ "چند ہم عصر" اُردو خاکہ نگاری کا شاہکار مانا جاتا ہے۔ یہ کتاب 1937ء میں شائع ہوئی۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں خاکوں کو مجموعہ کی شکل میں یک جان کیا گیا ہے۔ ترمیم شدہ ایڈیشن 1959ء میں چھپا۔ اِس کتاب میں کل چوبیس افراد کے خاکے ہیں۔

مولوی عبدالحق نے اِن خاکوں میں محبت یا عداوت سے بلند ہو کر تقریباً معروضیت کے ساتھ شخصیات کا مطالعہ کیا ہے کیونکہ وہ انسان اور انسانیت کی عظمت کے شناسا ہیں۔ آپ کے خاکوں میں سرسید احمد خان، حالی، نذیر احمد، اور نام دیو جیسے افراد شامل ہیں۔ "سرسید احمد خان "آپ کا سب سے طویل خاکہ ہے جس میں تحریکِ علی گڑھ اور سرسید کی شخصیت کے مختلف گوشے کھل کر سامنے آتے ہیں۔

اِسی طرح "نام دیو مالی "آپ کا انتہائی معروف اور فنی اعتبار سے بلند خاکہ ہے۔ مولوی عبدالحق کی اہم اور معروف و مقبول تصانیف میں قواعدِ اُردو، مرحوم دلی کالج، چند ہم عصر، اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ اور اُردو کا المیہ نیز ادبی تبصرے، مختلف تحقیقی و تنقیدی مقالات، قدیم شعراء کے مرتبہ متون اور مقدمات وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

مولوی عبدالحق کی خدمات کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اُنہوں نے اُردو زبان کو صرف ادبی اظہار کا وسیلہ نہیں سمجھا بلکہ اسے قومی، تعلیمی اور سائنسی زبان بنانے کی عملی جدوجہد کی۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری کا بنیادی رشتہ تحقیق اور مقدمہ نگاری سے جڑا ہوا ہے۔ اُنہوں نے اُردو میں عملی تنقید اور تحقیقی مقدمات کی مضبوط بنیاد رکھی۔ مولوی صاحب کی تنقید محض نظریاتی یا تاثراتی نہیں ہے، بلکہ یہ ٹھوس حقائق، اسناد اور علمی و تاریخی تحقیق پر مبنی ہے۔ اُن کے نزدیک تنقید کا مقصد صائب حقائق کی نشاندہی اور ادیب کی رہنمائی کرنا ہے۔ اُردو ادب میں باقاعدہ اور معیاری مقدمہ نگاری کا سہرا مولوی عبدالحق کے سر ہے۔ اُنہوں نے قدیم مخطوطات اور کتابوں پر جو مقدمات لکھے ان میں مصنف کے حالاتِ زندگی، عہد کی خصوصیات اور تصنیف کی ادبی لسانی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اگرچہ بعض ناقدین کے نزدیک اُن کی تنقید میں روایت پسندی کا عنصر موجود ہے، تاہم اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اُردو تحقیق اور لسانیات میں اُن کی خدمات بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اُن کے بغیر اُردو تحقیق کی تاریخ نامکمل تصور کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مطابق

"اگر بابائے اُردو مولوی عبدالحق نہ ہوتے اور اُردو سے اُنہیں یہ والہانہ وابستگی اور مجنونانہ لگاؤنہ ہوتا تو کیا واقعی موجودہ دور میں اُردو کو وہ مرتبہ حاصل ہوتا جو آج بہت سی زبانوں کے لیے باعثِ رشک ہے۔ اُنہوں نے اُردو کو اسکی اہمیت کا احساس دلایا، اِس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا، زندگی کی راہوں پر دوڑایا، اِس کے بازؤں میں حریفوں سے مقابلہ کی سکت پیدا کی۔ اُردو کی تاریخ مخالفت کی تاریخ، کشمکش کی تاریخ اور ہنگاموں کی تاریخ ہے۔ بابائے اُردو کی ذات نہ ہوتی تو اُردو کے لیے اِن منزلوں سے گزرنا آسان نہ ہوتا". تقسیمِ ہند کے بعد وہ پاکستان منتقل ہو گئے جہاں اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ بالآخر اُردو کا یہ مجاہد 16 اگست 1961ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا۔

بقول خالد رشید:

"جینا کوئی مولوی صاحب سے سیکھے تو مر کے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو دنیا کو جینے کا گُر سکھاتے ہیں کہ "ماز تخلیق مقاصد زندہ ایم۔" مولوی عبدالحق اُردو زبان کے ایسے معمار ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی اُردو کی خدمت میں گزاری۔ اُن کی تحقیقی بصیرت، لسانی مہارت، تنظیمی صلاحیت اور تعلیمی خدمات نے اُردو کو ایک مضبوط علمی شناخت عطا کی۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخِ اُردو میں اُن کا نام ہمیشہ "بابائے اُردو" کے طور پر احترام سے لیا جاتا رہے گا۔

بشکریہ پی بی سی ملتان

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں

محسنہ بخاری

عہدِ حاضر کے ممتاز شاعر احمد فراز نے اوائل عمری سے شعر گوئی اپنائی کیونکہ وہ تو موزوں طبع روزِ اوّل سے تھے۔ احمد فراز پشاور کے ایک سید متوسط گھرانے میں 1931ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کے والد سید محمد شاہ برق بھی فارسی اور اُردو کے عالم تھے۔ ظاہر ہے احمد فراز نے ایک علمی گھرانے میں آنکھ کھولی تو اُس کا اثر اُن کے ذہن و فکر پر بہت گہرا ہوا۔ احمد فراز نے بطور شاعر آغاز ہی سے کلاسکی ادب اور معاصر ادب کا دلجمعی سے مطالعہ کیا۔ وہ اُردو کے علاوہ فارسی ادب کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں اساتذہ کی شعر گوئی کا حُسن صاف سنائی پڑتا ہے۔ فراز کے کلام کی سلاست اور ملاحت نے اُنہیں شروع ہی سے عام و خاص کا ہر دل عزیز شاعر بنائے رکھا۔

اُن کی غزلوں اور نظموں میں بیسویں صدی کے رومانوی' سیاسی و سماجی موضوعات نہایت دل نشین انداز میں ملتے ہیں۔ احمد فراز نے 1950ء میں شاعری کا آغاز کیا اور خوش قسمتی سے اُنہیں پشاور کی ادبی فضاؤں میں آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ احمد فراز جن کا اصل نام احمد شاہ تھا، وہ 50 کی دہائی میں ریڈیو پاکستان پشاور سے سٹاف آرٹسٹ کے طور پر وابستہ ہوئے۔ اُس زمانے میں اُردو نظم کے رجحان ساز شاعر نون۔م۔ راشد ریڈیو پاکستان پشاور کے اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ احمد فراز نے نون۔م۔ راشد سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ 1957ء میں پروڈیوسر ہوئے اور پھر ریڈیو چھوڑ کر 1961ء میں پشاور یونیورسٹی میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ یہ دور احمد فراز کی شاعری کے عروج کا دور تھا۔

احمد فراز کے انفرادی شاعرانہ رنگ کے چند نمونے

میرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
میرا قلم تو عدالت میرے ضمیر کی ہے
اِسی لیے جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کی، زباں تیر کی ہے

اور

اب تو ہم گھر سے تو رکھ دیتے ہیں
طاق پر غیرتِ سادات بھی، دستار کے ساتھ
ہم کو اِس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چُن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

اپنے ایک مضمون "میں کیوں لکھتا ہوں" میں احمد فراز لکھتے ہیں!

"یقین مانیے جُوں جُوں وقت گزر رہا ہے میں اِس بات کا قائل ہوتا جا رہا ہوں کہ شاید مجھے نہیں لکھنا چاہیے۔ مگر میں لکھے بغیر رہ بھی نہیں سکتا۔ لکھنا میرے لیے زندگی ہے۔ میں نے جتنا بھی لکھا دام اور نام کے لیے نہیں لکھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اپنی شاعری کی بدولت شہرت بھی حاصل کر لی۔ میرے خیال میں جو لوگ پیسے اور نام کے لیے لکھتے ہیں وہ اکثر و بیشتر اِن دونوں چیزوں سے محروم ہو جاتے ہیں بلکہ اِن خواہشوں کے زیر اثر پروان چڑھنے والی شاعری بھی بری طرح سے متاثر ہوتی ہے۔ میں اپنے بارے میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ اگر شاعری میرے لیے شہرت اور دولت کا ذریعہ نہ بنتی تو شاید میں زیادہ بہتر لکھ پاتا کیونکہ پیسہ انسان کو آسائشوں میں ڈال دیتا ہے اور کئی پریشانیاں جو تخلیقی عمل کا باعث بنتی ہیں اُن کے امکان ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر میں نے اِن مشکلات کا سامنا نہ کیا ہوتا اور تنگدستی کا زمانہ بسر نہ کیا ہوتا تو "صراف" جیسی نظم نہ لکھ سکتا۔ ایسی ہی میری کئی نظمیں اور غزلیں اور بھی ہیں جنہیں خوشحالی کے دور میں لکھنا ممکن نہ تھا۔ اگر یہ نظمیں نہ ہوتیں تو اپنی شاعری کے ذریعے غربت، ناانصافی اور استحصال کے خلاف اتنی طویل جنگ میں کیسے لڑ سکتا تھا۔ خوشحالی کے اِس موضوع کے حوالے سے اپنا ایک شعر میرے ذہن میں آ رہا ہے۔

فراز تُو نے اِسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحبِ زر اور صرف شاعر تُو

قارئین! اِس مضمون سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ احمد فراز کس طبع کے شاعر تھے اور وہ کون سے محرکات تھے جنہوں نے احمد فراز جیسے عظیم شاعر کی شاعری اور سوچ و فکر کو ترتیب دیا۔ وہ ایک سچے شاعر تھے جو اپنی خارجی اور داخلی دونوں افکار کو لے کر اُن کو ایک لڑی میں پروتا جاتا ہے۔ احمد فراز کی شاعری بطور ترقی پسند شاعر کے بیسویں صدی کے سماجی، سیاسی اور فکری جہتوں کا آئینہ ہے۔ اِس لیے اُن کے ہاں منتخب معیاری کلام بے شمار ہے۔ اُن کی غزلیں اور نظمیں آج بھی عام و خاص میں بے انتہا پسند کی جاتی ہیں۔ احمد فراز اُردو ادب کا وہ عظیم شاعر ہے جسے کسی بھی طور پر جدید اُردو نظم اور غزل کے دور سے منفی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی اُس کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

بشکریہ پی بی سی راولپنڈی

عمدہ بی بی اور نواب عنایت کوٹیا

تحریر: محمد سعید احمد شیخ

پاکستان کے ابتدائی عہد کے دو عظیم عوامی گلوکار، جن کی آوازیں ریڈیو پاکستان کے آواز خزانہ میں محفوظ نہ ہو پائیں۔

دونوں میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی تھی: دونوں ایک ہی عہد کے پنجاب کے لوک گلوکار تھے۔ دونوں نے اپنی گائیکی میں لمبا سُر لگانے کی بدولت غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ دونوں نے لاؤڈا سپیکر عام ہونے سے پہلے میلوں، ٹھیلوں اور کُھلے میدانوں میں محض اپنے گلے کے زور پر اونچی آواز میں گا کر اپنے فن کا لوہا منوایا۔ دونوں کا تعلق کسی باقاعدہ یا موروثی گائیک گھرانے سے نہیں تھا۔

تاہم دیگر دو معاملات میں بھی دونوں یکساں اور بڑی حد تک ستم رسیدہ بھی ٹھہرے: دونوں اپنے عہد کی سماجی درجہ بندی میں کم تر سمجھے جانے والے محنت کش خاندانوں سے تعلق رکھنے کے سبب ادنیٰ ناموں سے منسوب اور مشہور ہوئے۔ عمدہ بی بی کو عمداں ماچھن اور نواب عنایت کوٹیا کو نواب کمہار کہا گیا ہے۔

عمدہ بی بی نے تو پتا نہیں اِس معاشرتی رویے پر اپنے کرب کا اظہار کیا یا نہیں، مگر نواب عنایت کوٹیا نے اپنی ایک جگنی میں خود کو کمی کہہ کر ایک منفرد احتجاج ضرور ریکارڈ کروایا۔ اُن کی جُگنی کے بول ہیں:

نام نواب تے ذات کمی دی،
جُگنی کراں تیار

(ترجمہ: نام نواب ہے، ذات کمی کی ہے اور میں جُگنی تیار کرتا ہوں۔)

یہ بول محض ایک گلوکار کا تعارف نہیں، بلکہ اُس زمانے کے پنجابی معاشرے کی طبقاتی ساخت پر مختصر مگر معنی خیز تنقید بھی ہیں۔ یہاں کمی سے مراد کوئی کم حیثیت انسان نہیں؛ پنجاب کے قدیم دیہی معاشرتی نظام میں یہ اصطلاح اُن محنت کش اور دست کار خاندانوں کے لیے استعمال ہوتی تھی جو اپنی فنی اور پیشہ ورانہ خدمات کے ذریعے گاؤں کی اجتماعی زندگی میں بنیادی کردار ادا کرتے تھے لیکن بدقسمتی سے عزت و تکریم سے محروم رہتے تھے

اور دوسرا یہ کہ اِن دونوں کی آوازیں بوجوہ لاہور ریڈیو کے محفوظ صوتی سرمائے کا حصہ نہ بن سکیں۔ جس زمانے میں لاہور ریڈیو اسٹیشن اپنی ابتدائی نشریاتی زندگی سے گزر رہا تھا، تقریباً اُسی زمانے میں لاہور میں کام کرنے والی گراموفون کمپنیوں نے عمدہ بی بی اور نواب عنایت کوٹیا کی آوازیں ریکارڈ کر کے اُن کی تھالیاں تیار کیں؛ مگر قسمت کا کھیل دیکھیے کہ گراموفون نے جن آوازوں کو محفوظ کر لیا، لاہور ریڈیو بوجوہ اُنہیں اپنے ذخیرۂ صوت آواز خزانہ میں محفوظ نہ کر سکا۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اِس محرومی کا سبب اُن کی شہرت میں کوئی کمی تھی۔ اُس زمانے کی گراموفون کمپنیاں ہر آواز پر سرمایہ صرف نہیں کرتی تھیں۔ اُن کی ترجیح عموماً وہی فن کار بنتے تھے جو میلوں، ٹھیلوں، اکھاڑوں اور عوامی اجتماعات میں اپنی مقبولیت اور گائیکی کا لوہا پہلے ہی منوا چکے ہوتے۔ عمداں اور نواب عنایت کوٹیا کے گراموفون ریکارڈ اِس امر کی گواہی ہیں کہ ریڈیو تک پہنچنے سے پہلے ہی اُن کی آواز پنجاب کے وسیع عوامی حلقوں میں اپنی جگہ بنا چکی تھی۔

عمدہ بی بی کا تعارف:

عمدہ بی بی سال 1910ء کے آس پاس متحدہ پنجاب کے ضلع فیروزپور کے ایک گاؤں سباجکے (جسے آج کل "پربھات سنگھ والا" کہا جاتا ہے) میں خوشی محمد کے گھر پیدا ہوئیں۔ خوشی محمد مشک کے ذریعے لوگوں کے گھروں تک پانی ڈھونے کا کام کرتے تھے اور یوں وہ اپنے اِس مخصوص پیشے کی نسبت سے مقامی معاشرت میں ماچھی کہلاتے تھے۔ ماچھی کا لفظ ماشکی (بمعنی مشک والا) کا غلط العام ہے۔

عمدہ بی بی ابھی تقریباً پانچ برس کی تھیں کہ اُن کے والدین یکے بعد دیگرے وفات پا گئے۔ ترکے میں کوئی زمین یا جائیداد بھی نہ تھی، تو اُنہیں مجبوراً کم عمری ہی میں اپنا پیٹ پالنے کے لیے لوگوں کے گھروں میں برتن اور دوسرے کام کاج کرنے پڑے۔

تنہائی، غربت اور یتیمی نے عمدہ بی بی کی شخصیت پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ وہ رات کو اپنے سُونے گھر میں دُکھی ہو کر بین الاپنے لگتیں۔ یہ بین بالعموم "کلی" کی شکل میں ظاہر ہوتے تھے۔

"کلی" پنجاب میں ایک مخصوص لوک نظم کو کہا جاتا ہے، جسے کسی باقاعدہ ساز کے بغیر بلند آواز اور مخصوص جذباتی لے میں گنگنایا یا گایا جاتا ہے۔

عمدہ بی بی کے گاؤں میں حضرت پیر محمد شاہ کا مزار تھا، جہاں ہر سال میلہ لگتا اور گرد و نواح کے دیہات کے فن کار انعام و اکرام کے لالچ میں اُس میں شریک ہوتے۔ عمدہ بی بی بھی پہلی مرتبہ اُسی میلے میں، شوق یا حالات کے جبر کے تحت، گانے کے لیے سامنے آئیں۔ عمدہ کی آواز میں بے پناہ سوز و درد تھا؛ اُنہوں نے جب اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے کان پر ہاتھ رکھ کر لمبی، درد بھری ہیک لگائی تو کئی سننے والے بے اختیار آبدیدہ ہو گئے۔

ہیک ٹھیٹھ پنجابی زبان کا لفظ ہے۔ ایک طویل آواز، لمبی پکار یا اونچی سُریلی آواز کو ہیک کہا جاتا ہے۔ 1895ء میں لاہور سے شائع ہونے والی ایک پنجابی لغت میں اِس لفظ کے معنی یوں درج ملتے ہیں:

A prolonged sound of the voice in singing; sound; calling.

(ترجمہ: گاتے ہوئے آواز کو دیر تک کھینچنا، لمبی آواز، طویل پکار۔)

(بحوالہ: بھائی مایا سنگھ، دی پنجابی ڈکشنری، منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، مفیدِ عام پریس، لاہور، 1895ء، 1990ئ)۔

عمدہ بی بی کو پہلی مرتبہ گاتے دیکھ کر کسی نے کہا کہ عمداں ماچھن نے کیا خوب گایا ہے! کسی اور نے یہ تبصرہ کر کے کہ ماچھن بہت دُکھی عورت ہے، انہیں دُکھی ماچھن کا نام دے دیا۔ روایت کے مطابق یہی نام کثرتِ استعمال سے مختصر ہو کر "دُکّی ماچھن" ہو گیا اور وہ اپنی زندگی میں زیادہ تر اِسی نام سے مشہور رہیں۔

لوگوں کی پذیرائی سے حوصلہ پا کر عمدہ بی بی نے خوشی رام نامی ایک ہندو گلوکار کو اپنا اُستاد بنایا اور اُن سے گائیکی کی باقاعدہ تربیت حاصل کی۔ وہ 'دوہرے' اور 'چھند' بلند سُر میں گاتیں اور پنجابی لوک کہانیوں، بالخصوص قصۂ ہیر رانجھا، اور ہجریہ گیتوں کو ہیک کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں پیش کرتی تھیں۔

عمدہ بی بی کی گائیکی کا سب سے نمایاں وصف لمبی ہیک تھی۔ وہ کان پر ہاتھ رکھ کر ہیک لگاتیں تو اُن کی بلند، کھنچی ہوئی اور درد میں ڈوبی آواز کھُلے میدان میں دُور تک پہنچتی۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی اپنے دُکھ پر بین کر رہا ہو۔

عمدہ بی بی نے عالمِ شباب میں قدم رکھا تو اُن کی شادی اپنے چچا کے بیٹے سے گاؤں "بلکیے ہِٹھاڑ" میں کر دی گئی، مگر شومئی قسمت، اُن کے دُکھوں کا سلسلہ شادی کے بعد بھی ختم نہ ہو سکا۔ کچھ عرصے بعد اُن کے شوہر کا بھی انتقال ہو گیا۔ اولاد بھی نہیں تھی؛ تاہم شوہر کی وفات کے بعد اُنہوں نے دوبارہ شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی باقی زندگی گائیکی کے لیے وقف کر دی۔

زندگی کے اِن پے در پے صدمات نے عمدہ بی بی کی آواز کے سوز و گداز کو مزید گہرا کر دیا۔ وہ بالخصوص ہجر، فراق اور جدائی کا کلام گاتی تھیں۔ اُن کے ایک گیت کے بول ہیں:

وے مینوں سُتی نوں کیویں دن چڑھ گیا،
وے میں کھیلن جانا دُور۔
اڑیا کلھ چڑھائیاں وے چوڑیاں،
اج ہو گئی اں چکنا چور!!

(ترجمہ: میری آنکھ لگ گئی اور دن چڑھ آیا۔ اِس گہری نیند کا مجھے دُکھ ہوا ہے کہ مجھے تو دُور کا سفر کرنا تھا۔ ارے دوست! تُو نے کل مجھے جو چوڑیاں پہنائی تھیں، دیکھو! وہ آج ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئی ہیں۔)

عمدہ بی بی جب ہجریہ اور فراقیہ کلام گاتیں تو اُن کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگتے اور سامعین بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پاتے۔ اُن کی آواز میں محض بلندی نہیں، ایک ایسی داخلی کسک بھی تھی جو غالباً یتیمی، غربت اور بیوگی کے ذاتی تجربات سے پیدا ہوئی تھی۔

حیرت کی بات ہے کہ بٹوارے کے بعد کے دونوں پنجابوں میں عمدہ بی بی کی ذات سے متعدد افسانہ ہائے عامہ (folklore) بھی منسوب ہوئے۔

ایک مشہور افسانۂ عامہ یہ ہے کہ جس زمانے میں لین دین آنے، دو آنے وغیرہ میں ہوتا تھا اور ایک روپیہ بہت بڑی رقم سمجھی جاتی تھی، یہاں تک کہ روایت کے مطابق ایک روپے میں ایک من گندم مل جاتی تھی، عمدہ بی بی کسی محفل میں ایک روپے سے کم کی ویل قبول نہیں کرتی تھیں۔

پنجاب کے میلوں اور اکھاڑوں میں کسی پسندیدہ فن کار کی آواز یا ادا سے خوش ہو کر دی جانے والی انعامی رقم کو ویل کہا جاتا تھا۔

ایک روپے سے کم ویل قبول نہ کرنے کا مقصد محض زیادہ معاوضہ حاصل کرنا نہیں بتایا جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ عمدہ بی بی چاہتی تھیں کہ اگر اُن کے فن کی قدر دانی کے لیے رقم نکلے تو کسی صاحبِ ثروت کی جیب سے نکلے، نہ کہ کسی غریب یا سفید پوش شخص کی محدود آمدنی سے۔ اُنہوں نے خود بچپن میں شدید غربت کا سامنا کیا تھا، اِس لیے وہ محنت کشوں اور غریب غرباء کی مجبوریوں سے اچھی طرح واقف تھیں۔

عمدہ بی بی سے منسوب ایک مشہور لوک کہانی یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ ضلع حصار کا ایک عمر رسیدہ کسان اُن کے پاس آیا اور فریاد کی کہ اُس کا بیٹا، جو عمدہ کی آواز کا شیدائی ہے، اپنا بیل فروخت کر کے حاصل ہونے والی تمام رقم اُس کی ویلوں پر لُٹا بیٹھا ہے۔ بزرگ نے بے بسی سے کہا: اب میں کھیت میں ہل کیسے چلاؤں گا؟ عمدہ بی بی نے یہ سنا تو اُس بزرگ نے اپنے بیل کی جو رقم بتائی، وہی کسی کمی بیشی کے بغیر اُس بوڑھے کسان کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

عمدہ بی بی کے بارے میں ایک اور مشہور لوک کہانی یہ ہے کہ لاہور کے ایک دولت مند زمیندار یا نواب نے اُنہیں اپنے کسی عزیز کی شادی میں گانے کے لیے مدعو کیا۔ وہ اُن کی آواز اور گائیکی سے اِس قدر متاثر ہوا کہ اُنہیں دل دے بیٹھا اور شادی پر اصرار کرنے لگا۔ عمدہ بی بی اپنے شوہر کی وفات کے بعد دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھیں، اِس لیے اُنہوں نے صاف انکار کر دیا۔ زمیندار نے اُنہیں لاہور کے ایک مکان کے بالائی حصے، یعنی چوبارے میں قید کر دیا، جبکہ مکان کے نچلے حصے میں اُس کے نوکروں کا پہرا رہتا تھا۔

ایک دن ایک فقیر یا مانگنے والا اُس گلی میں آیا تو عمدہ بی بی نے چوبارے کی کھڑکی سے اُس سے مدد کی منت سماجت کی اور اُسے اپنے گاؤں کا اتا پتا بتایا۔

لاہور سے فیروزپور کا درمیانی فاصلہ پچاس پچپن میل کا تھا اور فقیر اور جوگی وغیرہ حصولِ معاش کے لیے اتنی مسافت طے کر کے دُور دراز علاقوں تک بالعموم سفر کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ وہ فقیر اُن کا پیغام لے کر سباجکے پہنچ گیا۔

پیغام ملنے پر گاؤں کے دو نوجوانوں، ایشر سنگھ اور گوریا سنگھ، نے عمدہ بی بی کو لاہور سے نکالنے کی ذمہ داری قبول کی۔ گوریا سنگھ جوگیوں والی بین بجانا جانتا تھا، اِس لیے دونوں نوجوان جوگیوں کا بھیس بدل کر لاہور پہنچے۔ گوریا سنگھ نے چوبارے کے باہر بین بجائی تو عمدہ بی بی نے آواز پہچان لی۔ وہ رات کے وقت رسی کے ذریعے چوبارے سے نیچے اُتریں اور دونوں نوجوانوں کے ساتھ قید سے فرار ہو گئیں۔ جب وہ ستلج کے عین درمیان پہنچے تو نوجوانوں نے عمدہ بی بی سے کہا: اب وہ زمیندار تمہیں نہیں پکڑ سکتا؛ اب ایک ہیک لگاؤ۔

عمدہ بی بی نے دریا کے بیچ ایسی بلند اور طویل ہیک لگائی کہ اُن کی آواز ستلج کے دونوں کناروں تک سُنی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے اُس رات وہ ہیک سُنی، وہ زندگی بھر اُسے فراموش نہ کر سکے۔

یہ واقعہ تاریخی دستاویز سے زیادہ لوک داستان کا رنگ رکھتا ہے، مگر اِس سے عمدہ بی بی کی آواز کی غیر معمولی قوت اور عوام میں اُن کی شہرت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ عمدہ بی بی سے وابستہ ایک اور مشہور روایت یہ ہے کہ اُن کی گائیکی سے خوش ہو کر دو مختلف جاگیرداروں نے اُنہیں دو گاؤں جاگیر میں دے دیے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جلال آباد کے جاگیردار نے اُن کی فرمائش پر جلال آباد سے بگیکے ہٹھاڑ تک سڑک بھی تعمیر کروائی۔ بتایا جاتا ہے کہ بٹوارے کے بعد بھی کئی دہائیوں تک یہ دونوں گاؤں مقامی طور پر عمدہ بی بی کے نام سے منسوب رہے؛ تاہم اِس روایت کی تصدیق کے لیے باقاعدہ کوئی اراضی ریکارڈ ابھی تک سامنے نہیں آیا۔

عمدہ بی بی کی مقبولیت محض میلوں، ٹھیلوں اور اکھاڑوں تک محدود نہیں رہی۔ 1938ء میں ایک معروف گراموفون کمپنی نے اُن کی آواز ریکارڈ کرنے کے لیے اُن سے رابطہ کیا اور 1939ء میں اُن کا پہلا گراموفون ریکارڈ، جسے اُس زمانے میں عام طور پر "توا" یا "تھالی" کہا جاتا تھا، بازار میں آیا۔ اُس ریکارڈ کا نمبر ایف۔1270 بتایا جاتا ہے۔ بعد ازاں اُن کے مزید ریکارڈ بھی جاری ہوئے اور اُن کی آواز پنجاب کے اُن علاقوں تک پہنچ گئی جہاں وہ خود جا کر نہیں گا سکتی تھیں۔

اُن کے گراموفون ریکارڈوں کی مقبولیت کا اندازہ اِس روایت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ شادی بیاہ کے لیے لاؤڈ اسپیکر بک کراتے وقت لوگ سب سے پہلے یہ پوچھتے تھے: "تیرے کول دُکی دے ریکارڈ ہن؟ یعنی تمہارے پاس دُکی کے ریکارڈ موجود ہیں؟" یہ گراموفون ہی تھا جس نے کھلے میدانوں اور میلوں میں گونجنے والی عمدہ بی بی کی آواز کو وقت اور فاصلے کی قید سے نکال کر پنجاب کے گھروں اور شادی بیاہ کی محفلوں تک پہنچایا۔

تقسیمِ ہند کے موقع پر عمدہ بی بی کو بھی اپنا آبائی گاؤں چھوڑنا پڑا۔ ایک معروف مقامی روایت کے مطابق سباجکے کے لوگ اُنہیں پاکستان جانے نہیں دینا چاہتے تھے، مگر 1948ء کے پُر آشوب حالات میں اُن کا وہاں بھارت میں رہنا ممکن نہ رہا۔ بالآخر وہی ایشر سنگھ اور گوریا سنگھ، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے کبھی لاہور کی قید سے اُنہیں نکالا تھا، اُنہیں اپنی حفاظت میں ستلج پار کرا کے پاکستان کی جانب چھوڑ گئے۔

پاکستان پہنچ کر عمدہ بی بی پاکپتن میں آباد ہوئیں اور کچھ عرصہ گاتی بھی رہیں۔ یہاں بھی اُن کی آواز کی قدر کی گئی، مگر کہا جاتا ہے کہ ہجرت کے بعد اُن کا دل ماں، باپ اور اپنے شوہر کی قبروں سے دوری کے سبب پوری طرح نہ لگ سکا۔ آبائی گاؤں اور اپنے بچپن اور جوانی کے دنوں کی سباجکے سے جڑی یادوں نے اُنہیں اندر سے توڑ دیا۔ تقسیم کے تقریباً پانچ یا چھ برس بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ اِس حساب سے اُن کی وفات 1953ء یا 1954ء کے لگ بھگ بنتی ہے، لیکن وفات کی صحیح تاریخ اور قبر کا مقام ابھی تک دستیاب معلومات میں درج نہیں۔

عمدہ بی بی کی زندگی کے بہت سے واقعات دستاویزی تاریخ کے بجائے عوامی حافظے، مقامی روایتوں اور افسانہ ہائے عامہ کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں۔ اِن روایتوں میں وقت کے ساتھ مبالغہ یا داستانی رنگ شامل ہو جانے کا امکان اپنی جگہ موجود ہے۔

تاہم عمدہ بی بی کی گراموفون ریکارڈنگ، غیر معمولی ہیک، ہجریہ کلام اور مشترکہ پنجاب میں بے مثال عوامی مقبولیت ایسے حقائق ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔ آج بھی اُن کی آواز کی نادر و نایاب ریکارڈنگز ایمازون میوزک جیسے عالمی شہرت یافتہ پلیٹ فارم پر موجود ہیں جو اُن کے فن کی بلندی کا مُنہ بولتا ثبوت ہیں۔

وہ کسی موروثی گائیک گھرانے کی تربیت یافتہ فن کار نہیں، بلکہ غربت، یتیمی اور ذاتی صدمات کی آگ سے گزر کر پنجاب کی ایک عظیم عوامی آواز بنی تھیں۔ گراموفون نے اُن کی آواز کے کچھ نقوش محفوظ کر لیے، مگر لاہور ریڈیو کا ذخیرۂ صوت اُن کی جادوئی ہیک سے محروم رہ گیا۔ اِس کی وجہ شاید اُن کا پاکپتن کے کسی گاؤں کو اپنا ٹھکانہ بنانا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لاہور میں زمیندار کے ہاتھوں اپنی قید کے دنوں کی تلخ یادوں کے سبب وہ لاہور آنے سے کتراتی رہی ہوں۔

نواب عنایت کوٹیا کا تعارف

اِن کا اصل نام نواب علی تھا۔ سالِ پیدائش اور والد کا نام صحت کے ساتھ معلوم نہیں۔ اِن کے بارے میں صرف اِس قدر معلومات دستیاب ہیں کہ یہ متحدہ پنجاب کے ضلع گوجرانوالہ کی تحصیل وزیر آباد کے گاؤں کوٹ عنایت خاں کے ایک کمہار، یعنی مٹی کے برتن بنانے والے، گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اپنے گاؤں کی نسبت سے نواب عنایت کوٹیا اور خاندانی پیشے کی نسبت سے نواب کمہار کے نام سے مشہور ہوئے۔

اگرچہ نواب عنایت کوٹیا کی پیدائش کے ساتھ ساتھ وفات کی صحیح تاریخیں بھی دستیاب نہیں، تاہم اِس گلوکار کی فنی سرگرمیوں اور گراموفون ریکارڈوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیسویں صدی کی

ابتدائی دہائیوں، بالخصوص 1925ء اور اُس کے بعد، پنجاب کے معروف لوک گلوکاروں میں شمار ہونے لگے تھے۔

نواب عنایت کوٹیا کا تعلق بھی کسی موروثی گائیک گھرانے سے نہیں تھا۔ اُنہوں نے محض اپنے شوق کے باعث ایک قریبی گاؤں کے لوک گلوکار اللہ دتہ وڑائچ کو اپنا اُستاد بنایا اور اُن سے قصہ گائیکی کی تربیت حاصل کی۔ یہ تربیت کلاسیکی موسیقی کی کسی باقاعدہ درس گاہ میں نہیں، بلکہ پنجاب کی زبانی روایت کے مطابق اُستاد اور شاگرد کے باہمی تعلق کے ذریعے ہوئی۔ نواب نے اپنے اُستاد سے لوک داستان کو سُر، لے، مکالمے اور طویل ہیک کے ساتھ پیش کرنے کا فن سیکھا اور پھر اِسی روایت میں اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ نواب عنایت کوٹیا کی گائیکی کا بنیادی وصف اُن کی بلند، توانا اور دُور رس آواز تھی۔ آپ قصے کے کسی اہم مقام پر سُر کو دیر تک کھینچتے اور ایسی طویل ہیک لگاتے کہ کھلے میدان میں بیٹھے دُور کے سامعین تک آواز پہنچ جاتی۔ لاؤڈ اسپیکر عام ہونے سے پہلے میلوں، ٹھیلوں اور اکھاڑوں میں گلوکار کی کامیابی کا انحصار بڑی حد تک اُس کے گلے کی طاقت، سانس کی طوالت اور مجمعے کو اپنی گرفت میں رکھنے کی صلاحیت پر ہوتا تھا۔ نواب عنایت کوٹیا اِن تینوں اوصاف کے حامل تھے۔ نواب عنایت کوٹیا محض گلوکار نہیں، بلکہ قصہ گو، نغمہ نگار اور اپنے کلام کے طرز ساز بھی تھے۔ وہ پنجاب کی طویل لوک داستانوں کو چھوٹے چھوٹے گیتوں، مکالموں اور گائے جانے کے قابل واقعات میں تقسیم کر کے پیش کرتے تھے۔ اِس طرز میں وہ کبھی راوی بن جاتے، کبھی داستان کے کسی کردار کی آواز اختیار کر لیتے اور کبھی سوال و جواب کی صورت میں پورا منظر سامعین کے سامنے زندہ کر دیتے تھے۔ نواب عنایت کوٹیا کی گائیکی میں عموماً بھاری سازوں کی کثرت نہیں ہوتی تھی۔ اُن کی اصل قوت اُن کا گلا، لفظ کی واضح ادائیگی، داستانی مکالمہ اور طویل ہیک تھی۔ دستیاب تذکروں کے مطابق جنا نامی فن کار اُن کے ساتھ جوڑی یا الغوزہ بجاتا تھا۔ یوں مختصر سازینہ اور طاقت ور انسانی آواز مل کر اُن کی قصہ گائیکی کی مخصوص فضا قائم کرتے تھے۔ نواب عنایت کوٹیا کے گائے ہوئے قصوں اور داستانی موضوعات میں ہیر رانجھا، سسی پنوں، مرزا صاحباں، سوہنی مہینوال، پورن بھگت، دلا بھٹی، ڈھول شہزادہ سمی، شاہ بہرام اور حُسن بانو اور جنگ جیمل فتح خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کی محفوظ ریکارڈنگز میں "ہیر تے قاضی دے سوال جواب، ہیر دے سوال جواب اور سوہنی دا حُسن" جیسے عنوانات بھی ملتے ہیں۔ اِن عنوانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی داستان کو محض بیان نہیں کرتے تھے، بلکہ اُس کے واقعات اور کرداروں کو مکالمے، سُر اور جذباتی ادائیگی کے ذریعے ایک جیتی جاگتی ڈرامائی صورت عطا کر دیتے تھے۔ نواب عنایت کوٹیا کی سب سے نمایاں فنی شناخت جُگنی بنی۔ جُگنی پنجابی لوک گائیکی کی وہ صنف یا بیانیہ ترکیب ہے جس میں گلوکار ایک فرضی کردار جُگنی کو مختلف شہروں، دیہاتوں، میلوں اور معاشرتی حالات کا مشاہدہ کراتا ہے۔ مثال کے طور پر، اپنے بولوں جُگنی ٹُر چلی لاہور یا جُگنی جا پہنچی لدھیانے وغیرہ کے ساتھ، جُگنی جہاں جاتی ہے وہاں کے لوگوں، رسم و رواج، حالات اور معاشرتی تضادات پر کوئی نہ کوئی تبصرہ کرتی ہے۔ اِس صنف میں گلوکار کو حالاتِ حاضرہ، ظرافت، سماجی مشاہدے اور برجستہ شعر گوئی کی خاصی گنجائش ملتی ہے۔

جُگنی کی ابتداء کے بارے میں مختلف روایتیں موجود ہیں، اِس لیے نواب عنایت کوٹیا کو قطعی طور پر جُگنی کا موجد یا پہلا گلوکار کہنا تاریخی احتیاط کے منافی ہو گا۔ البتہ اُنہیں جُگنی کے قدیم ترین معروف اور ریکارڈ شدہ گلوکاروں میں ضرور شمار کیا جا سکتا ہے۔ اُن کی گائی ہوئی جُگنی نے اِس صنف کو میلوں اور اکھاڑوں سے نکال کر گراموفون کی تھالی تک پہنچایا اور بعد کی نسلوں کے لیے ایک قابلِ تقلید طرز قائم کر دیا۔ ایک معروف زبانی روایت کے مطابق مشہور لوک گیت "دم گٹکوں، دم گٹکوں۔۔۔دم گٹکوں گٹکوں کرے سائیں۔۔۔ایہہ تے کلمہ نبی دا پڑھے سائیں" بھی سب سے پہلے نواب عنایت کوٹیا نے گایا تھا۔ بعد میں عالم لوہار اور پھر عارف لوہار کی آوازوں نے اِس بند کو غیر معمولی شہرت بخشی۔

بعض تذکروں میں نامور پنجابی لوک گلوکار عالم لوہار کو نواب عنایت کوٹیا کا شاگرد یا اُن کے طرز سے گہرا اثر قبول کرنے والا فنکار بتایا گیا ہے۔ اِس اُستاد شاگرد کے تعلق کی مکمل دستاویزی تفصیل دستیاب نہیں، لیکن دونوں کی جُگنی، قصہ گائیکی، بلند آواز، طویل ہیک اور عوامی اسلوب میں نمایاں مماثلت ضرور پائی جاتی ہے۔ عالم لوہار نے بعد میں ریڈیو، ٹیلی وژن اور گراموفون کے ذریعے جُگنی کو عالم گیر شہرت دی، مگر اِس طرز کی ابتدائی ریکارڈ شدہ صورت نواب عنایت کوٹیا کے ہاں پہلے سے موجود تھی۔

نواب عنایت کوٹیا کے بیٹے سرجا اور مرزا بھی گاتے تھے، جبکہ اُن کا بیٹا بوٹا ساز پر اُن کا ساتھ دیتا تھا۔

یوں اگرچہ نواب خود کسی موروثی گائیک گھرانے سے نہیں آئے تھے، اُن کے بعد اُن کے خاندان میں قصہ گائیکی اور ساز نوازی کی روایت کسی حد تک جاری رہی۔ بعد کی نسل میں رفیق کمہار، لطیف کمہار اور حنیف کمہار ٹیڈی نے بھی لوک داستانوں اور ماہیوں کی اِسی روایت کو آگے بڑھایا۔ اِس طرح نواب عنایت کوٹیا کا فن محض اُن کے گراموفون ریکارڈوں تک محدود نہ رہا، بلکہ خاندان، شاگردوں اور بعد کے لوک گلوکاروں کے ذریعے بھی منتقل ہوتا رہا۔

نواب عنایت کوٹیا کی آواز کو اُن کے عہد کی گراموفون کمپنیوں نے ریکارڈ کیا۔ اُن کے متعدد ریکارڈ آج ڈیجیٹل صورت میں ایپل میوزک اور ایمازان میوزک پر بھی دستیاب ہیں۔ یہ ریکارڈ اِس امر کی گواہی ہیں کہ وہ اپنے زمانے کے مقبول عوامی فن کار تھے اور اُن کی آواز تجارتی طور پر ریکارڈ کیے جانے کے قابل سمجھی جاتی تھی۔ کچھ دستیاب تذکروں میں نواب عنایت کوٹیا کے بارے میں بعض متضاد باتیں بھی ملتی ہیں؛ مثلاً یہ کہ وہ 1933ء میں ریڈیو پاکستان لاہور سے مشہور ہوئے، حالانکہ اُس وقت نہ ریڈیو پاکستان وجود میں آیا تھا اور نہ لاہور ریڈیو اسٹیشن نے اپنی باقاعدہ نشریات شروع کی تھیں۔ اب تک دستیاب شواہد یہی بتاتے ہیں کہ نواب عنایت کوٹیا کی شہرت کا اصل میدان ریڈیو اسٹوڈیو نہیں، بلکہ پنجاب کے میلے، ٹھیلے، اکھاڑے اور گراموفون ریکارڈ تھے۔ اُن کی آواز اپنے زمانے میں عوام تک ضرور پہنچی، مگر لاہور ریڈیو کے محفوظ صوتی سرمائے میں اُن کی کوئی یقینی ریکارڈنگ سامنے نہیں آ سکی۔ وہ حقیقت میں ریڈیو پاکستان لاہور پر ریکارڈ یا نشر کیوں نہ ہو سکے، یہ معاملہ ابھی صیغۂ راز میں ہے۔ ممکن ہے اُن کی سادہ طبیعت، ناخواندگی یا دیہی ماحول سے وابستگی اُنہیں اِس قومی ادارے سے رابطے سے دور رکھے رہی ہو۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ ریڈیو کو اُن کی ضرورت تھی، اُنہیں ریڈیو کی نہیں۔

فن اپنی قدر خود منواتا ہے۔ آج بھی بٹوارے کے بعد قائم ہونے والے دونوں پنجابوں میں فنِ موسیقی کے قدر دان عمدہ بی بی اور نواب عنایت کوٹیا کو نہایت اعلیٰ القاب سے یاد کرتے ہیں۔ عام لوگ آج بھی اُن کی آواز، گائیکی اور غیر معمولی ہیک سے وابستہ وہ لوک روایتیں، بلکہ بعض دیومالائی قصے تک، اپنی چوپالوں اور بیٹھکوں میں اپنی نئی نسل کو سنواتے ہیں، جو اُنہوں نے اپنے دادا پردادا سے سُنے تھے۔

لاہور ریڈیو اسٹیشن کا افتتاح 1938ء میں آل اِنڈیا ریڈیو کے ایک اسٹیشن کی حیثیت سے ہوا۔ 1948ء میں جب یہ آزاد مملکتِ پاکستان کا ریڈیو اسٹیشن بنا تو عمدہ بی بی اور نواب عنایت کوٹیا، دونوں حیات تھے اور کسی نہ کسی صورت میں اپنے فن کی آبیاری بھی کر رہے تھے۔ تاہم نامعلوم وجوہات کی بناء پر ریڈیو پاکستان لاہور اُن دونوں کی آوازوں کو اپنے ذخیرۂ صوت میں محفوظ نہ کر سکا۔

اگر اُن کی آوازیں آج ریڈیو پاکستان کے صوتی بینک آواز خزانہ میں موجود ہوتیں تو نہ صرف اُن دونوں کے فن کو بقاء ملتی، بلکہ خود اِس قومی صوتی خزانے کی قدر، توقیر اور تاریخی اہمیت میں بھی کہیں زیادہ اضافہ ہو جاتا۔

عمدہ بی بی اور نواب علی کے زمانے کے بے قدر لوگ اُنہیں اُن کے محنت کش خاندانی پسِ منظر کی نسبت سے ماچھن اور کمہار جیسے نام دے کر اُن کی عظیم فنی شناخت کو پیشہ ورانہ نسبتوں کے باعث کم تر کرنے کی کوشش کرتے رہے؛ مگر ریڈیو پاکستان جیسے فن شناس اور قدر دان قومی ادارے کے لیے عمدہ بی بی آج بھی اسمِ بامسمیٰ، ایک عمدہ گلوکارہ، اور نواب عنایت کوٹیا اپنے فن کے حقیقی نوابِ فن ہیں۔

اگرچہ ریڈیو پاکستان کو اِن دونوں عظیم عوامی گلوکاروں کی آوازیں اپنے ذخیرۂ صوت میں محفوظ کرنے کا اعزاز حاصل نہ ہو سکا، لیکن اِس کے باوجود یہ ادارہ اُن کے فن کا معترف ہے۔ اِس اعتراف کا ایک ثبوت یہ تفصیلی مضمون ہے، جسے دنیا بھر میں ہمارے قارئین پڑھ رہے ہیں۔ اِس مضمون کا ایک نسخہ گرمکھی رسم الخط میں بھی جلد ہی ریڈیو پاکستان کے سرکاری فیس بک اکاؤنٹ پر شائع کیا جائے گا۔

اُن دونوں کی آوازیں محفوظ نہ رہ سکیں، لیکن پنجاب کے عوامی حافظے میں اُن کی یاد اور اُن کے فن کی گونج آج بھی زندہ ہے اور ریڈیو پاکستان کے ادارہ جاتی حافظے میں بھی۔

یاد گار گیتوں کا خالق موسیقار۔۔۔۔ اختر حسین اکھیاں

تحریر : محمد ظہیر بدر

اِسے نیرنگیِ زمانہ کہیئے یا ستم ظریقی جس کو ایک شاعر نے بڑے دلچسپ اور طرزِ دلبری کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔

کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے
ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے

امرِ واقعی یہ ہے کہ فنی پختہ کاری کسی فنکار کی مقبولیت کی ضمانت نہیں۔ دورِ حاضر میں بھی ایسے مقبول فنکاروں کی کمی نہیں جنہیں موسیقی کی ماہرانہ شُدبُد نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ :

خدا نے اُن کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے

گویا زندگی کے ہر شعبے میں مقبولیت کی ضمانت لیاقت و فراست اور ذہانت ہی نہیں کچھ اور بھی ہوتا ہے اور وہ کیا ہے۔ اِس کے بارے میں مختلف لوگوں کا مختلف مؤقف ہے۔
م حسن لطیفی ایک فراموش کردہ شاعر کا یہ شعر بھی سن لیجئے۔

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا

اختر حسین اکھیاں کی یاد سے کچھ تلخیاں تو نہیں تھیں بلکہ وہ تو ایسے خوش گوار کن رس گیت تھے جنہیں سُنیں تو دل جھوم جھوم اُٹھتا ہے۔ ایسے گیت آج کی پوپ موسیقی کی گرد میں سماعتوں میں رس گھولتے ہیں۔ چنانچہ اگرم لطیفی کے اِس شعر کے جواب میں یہ جملۂ معترضہ ہے کہ فراموش کرنے کے لیے تلخ یادوں ہی کا ہونا ضروری نہیں۔ کئی افراد یونہی فراموش کر دیئے جاتے ہیں۔ اِس "فراموشی" کی وجوہات تلاش کرتے ہوئے پتا چلا کہ کچھ لوگ اِسے یوں کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ "ویلے ویلے دی گل ہے"۔ بعضوں کے نزدیک دولت کی طرح شہرت بھی قسمت اور محنت کے تال میل سے ملتی ہے۔ جبکہ بعض لوگ اِس سوال کا جواب علامہ اقبالؒ کے اِس شعر میں ڈھونڈتے ہیں۔

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے

یعنی لوگوں کو بعض فنکار یا اُن کا فن بھا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے اور کسی فنکار کا اپنے فن میں یدِ طولی رکھنا ایک الگ حقیقت ہے۔ مگر اُن کی یہ مہارت عوام الناس کو بھاتی نہیں یا اُن کی توجہ نہیں حاصل کر پاتی۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی فنکار کو ناپسندیدگی کی بنیاد پر فراموش کر دیا جاتا ہو۔ یقیناً پسند اور ناپسند کے درمیان میں ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے اور یہ وجہ دل کو کسی دُھن، کسی آواز کسی بول کا بھا جانا ہے۔

یہ طے ہے کہ جنہیں فراموش کر دیا جاتا ہے، اُن سے لاتعلقی، بے اعتنائی یا ناپسندیدگی کا ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ ہم اِس سوال کا کسی قدر تسلی بخش جواب علامہ اقبالؒ کے مذکورہ بالا شعر میں تلاش کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ کیونکہ بہت سے گلوکار ایسے ہیں جن کا ایک ہی گانا مقبول ہوتا ہے۔ اُس کے بعد اُن کی مقبولیت کے سفر کا اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ ایسے گلوکاروں میں ایس بی جان (تُو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے)، شرافت علی (جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں)، فضل حسین (آج یہ کس کو نظر کے سامنے پاتا ہوں میں) اور اعجاز قیصر (آنکھ برسی ہے ترے نام پہ ساون کی طرح) وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان لاہور نے جہاں غلام علی جیسے نامور گلوکار پیدا کیے وہیں حسین بخش گلو جیسے سُریلے گلوکار بھی پیدا کیے۔

پاکستان ٹیلی ویژن کے زمانۂ عروج میں "تیرے نام" کے عنوان سے ایک موسیقی کا پروگرام پیش کیا جاتا تھا جس کے میزبان مستنصر حسین تارڑ تھے۔ اُس پروگرام میں پاکستان کے تقریباً سبھی گلوکاروں نے شرکت کی۔ فنکاروں کی بات چیت کے دوران بعض فنکاروں سے یہ سوال پوچھا جاتا کہ "آپ اپنے بعد آنے والے کس گلوکار کو بہتر سمجھتے ہیں ؟ "اِس سوال کا جواب حیران کن حد تک متعدد فنکاروں نے حسین بخش گلو دیا۔ لیکن خاصانِ موسیقی اور اعلی مزاجِ موسیقی رکھنے والوں کے سوا کتنے لوگ ہیں جو اِس عظیم گلوکار کا نام جانتے ہیں۔ اِسی طرح اگر پاکستانی موسیقاروں کا نام لیں تو اُن کی طویل فہرست ہے۔ مگر فلمی تذکروں میں یا گفتگو میں جی اے چشتی، خواجہ خورشید انور، رشید عطرے، ماسٹر عنایت حسین، ماسٹر عبداللہ، روبن گھوش، نذیر علی، ایم اشرف کا نام لیا جاتا ہے۔ جبکہ دل نشین اور مقبول گیتوں کے خالق موسیقاروں میں کچھ اور نام بھی ہیں "جن کا نہیں ہے کوئی نام"۔ اِن بے نام موسیقاروں میں ایک نام اختر حسین اکھیاں کا بھی ہے (ہر چند انفرادی طور پر اُن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا جاتا ہے پاکستان کے معروف موسیقار مگر معروف موسیقاروں کی صف میں اُن کا نام خال خال ہوتا ہے) جن کے کریڈٹ پر بڑے یاد گار گیت ہیں جن میں سے چند ایک ذیل میں مذکور ہیں۔

☆کلی کلی جان دُکھ لکھ تے کروڑ وے
دور جان والیا! مہاراں ہن موڑ وے (پاٹے خاں)
☆اپنی کہانی یارو، کس نوں سناواں
جُرماں توں ود مینوں ملیاں سزاواں (پیار نہ منے ہار)
☆ایتھے سودے قول قراراں دے
دل وِکدے نئیں دلداراں دے (سدھارستہ)
☆مکھ تیرا چناں کڈا پیارا لگدا اے ہو
چن تیرے اگے ساہنوں تارا لگدا اے ہو (سدھارستہ)
☆اِک اِک شے چناں لبھ کے سجائی اے
تیرے لئی میں نویں دنیا وسائی اے (سدھارستہ)
☆کر کے بہانے اساں رات ساری ٹالی اے
چناں کدوں آویں گا سویر ہوون والی اے (سدھارستہ)
☆گھڑیاں آئی میت ملن کی (نیلا پربت)
☆اے وطن اسلام کی اُمید گاہ تجھ پر سلام (معجزہ)
☆ڈاھڈا بھیڑا عشقے دا روگ (رن مرید)
☆چُن کے لائی کرن پھول
داسی توری قدم دُھول (ٹیپو سلطان)

فلمی دنیا کے بھی نرالے رنگ ہیں۔ جب کوئی فلم ہٹ ہوتی ہے تو اُس کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے فنکاروں کو کام ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن فلم کی ناکامی اُس فلم سے تعلق رکھنے والے فنکاروں کے فن پر پانی پھیر دیتی ہے۔ اختر حسین اکھیاں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ جب تک اُن کی فلمیں ہٹ ہوتی رہیں اُنہیں کام ملتا رہا۔ جبکہ فلموں کی ناکامی کے بعد اُنہیں کام ملنا بند ہو گیا۔ حالانکہ کسی فلم کی ناکامی میں اُس کے گیتوں کا مکمل کردار نہیں ہوتا۔ کیونکہ کسی فلم کی کہانی، مکالمے، کیمرا گرافی، اور ڈائریکشن بھی اہم ہوتے ہیں۔

اکثر اوقات دیکھا گیا کہ ایک فلم جو ناکام ہوئی اُس کے گیت بہت مقبول ہوئے۔ جس کی مثال مقبول فلمی جوڑی نیر سلطانہ اور درپن کی فلم "عظمت" کے گیتوں سے دی جا سکتی ہے۔ خاص طور پر قتیل شفائی کا لکھا موسیقار شوکت حسین دہلوی المعروف ناشاد کا ترتیب دیا گیا اور مہدی حسن کا گایا ہوا یہ گیت ہے :

زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں
میں تو مر کر بھی مری جان تجھے چاہوں گا

اِس فلم کے فلاپ ہونے کے باوجود موسیقار ناشاد کی مقبولیت پر کوئی اثر نہ پڑا اور اُس کے بعد بھی اُنہوں نے بیسیوں فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔ بہر حال قصہ کوتاہ، اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔ چنانچہ اختر حسین اکھیاں کے مقدر نے یاری نہ کی تو اُنہوں نے ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی وژن کا رُخ کیا یہاں اُنہوں نے موسیقی کے کئی پروگراموں کی موسیقی ترتیب دی۔

اختر حسین اکھیاں 1937ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے فلمی سفر کا آغاز 1955ء میں فلم "پاٹے خان" سے ہوا تھا۔ اُنہوں نے 34 فلموں میں 179 گیتوں کو سُر سے سجایا جن میں پردیسن، آس پاس، پہاڑن، ہڈ حرام، بھولے خان، دیوداس، پیار نہ منے ہار، سیدھا راستہ، شگناں دی مہندی، خان دے خان پروہنے اور ٹیپو سلطان کے نام سر فہرست ہیں۔ اُنہیں المیہ گیتوں کی دُھنیں بنانے میں کمال حاصل تھا۔ وہ ہمیشہ معیاری اور نئی کمپوزیشنز بناتے تھے جو کہانی کے ماحول، سچویشنز اور اداکار یا اداکارہ کی مناسبت سے ہوتی تھیں۔

اختر حسین اکھیاں موسیقار عاشق حسین کے برادر بزرگ تھے۔ پاکستان کی مشہور گلوکارہ کوثر پروین اُن کی اہلیہ تھیں اور پاکستان کی پہلی فلم "تیری یاد" کے موسیقار ماسٹر عنایت علی ناتھ کی تیسری صاحبزادی اور تیری یاد کی ہیروئن آشا بھوسلے اور رانی کرن کی بہن تھیں جن کا نوجوانی ہی میں 1967ء کو 34 سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اختر حسین اکھیاں کا انتقال 18 اگست 2003ء کو لاہور میں ہوا۔ اُنہیں لاہور کے مشہور اور سب سے بڑے قبرستان میانی صاحب کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

بشکریہ پی بی سی لاہور

نصرت فتح علی خان

قوالی کو صوفی ازم میں کلیدی حیثیت حاصل ہے ۔صوفیائے اسلام نے قوالی کو تبلیغِ دین کی نشرو اشاعت کے لیے ایک کار گر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ خاص طور پر بر صغیر پاک وہند کے خطے کو کفرو شرک کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ اسلام کی آمد سے قبل یہاں کے باشندے اپنے مذہبی رسم و رواج سے لے کر شادی بیاہ، خوشی غمی، حتیٰ کہ بچوں کی پیدائش سے لے کر انسانوں کی موت تک ہر موقع پر اپنے دِلی جذبات کا اظہار ناچ گا کر ہی کیا کرتے تھے۔ جب مسلمان فاتحین نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی تو وہ تبلیغِ اسلام کی غرض سے اپنے ساتھ جید علمائ، صوفیہ عظام اور اولیاء کرام کو بھی لائے مگر یہاں تبلیغِ دین کے سلسلہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ہندو دھرم اور بدھ مت کے ماننے والے لاکھوں لوگ اپنی صدیوں پرانی روایات اور ثقافت سے مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ ناچ گانا اُن کی رگوں میں سمایا ہوا تھا اور یہ لوگ کسی طرح اِس سے باہر کو تیار نہیں تھے۔ ایسی نازک صورتِ حال میں مسلم اکابرین بالخصوص صوفیہ عظام نے محفلِ سماع کے اہتمام کی تدبیر کی اور جب آواز کے ساتھ ساز بھی شامل ہوا تو قوالی وجود میں آئی۔ اِس طرح ساز و آواز کے سنگم راگ نے راگ راگنیوں اور ٹھمریوں کے رچاؤ سے گائیکی کو اِس قدر رسیلہ پن ملا کہ سننے والے کانوں میں رس گھولنے لگا۔ عوام اِن خوبصورت آوازوں کا تعاقب کرتے محافلِ سماع و قوالی میں پہنچنے لگے۔ اِس طرح اولیاء اللہ اور صوفیائے عظام نے ہندوؤں کے مشرکانہ عقائد و رسومات کے مقابل اسلامی عقائد و نظریات، عقیدہِ توحید ورسالت، اخلاقیات، انسان دوستی، رحم، بردباری، ایمانداری، محبت واُنسیت، ایثار وقربانی، مساوات، عدل وانصاف، تزکیۂ نفس اور عقیدہ یومِ حساب جیسی اعلیٰ وارفع صفات کا پرچار کرنا شروع کیا اور لوگ اِس پیغامِ امن و سلامتی سے متاثر ہو کر جوق در جوق حلقہ بگوشِ اسلام ہونے لگے۔ قوالی اپنے اوّلین دور کی طرح آج بھی لوگوں کے لیے روحانی سکون، قلبی، ذہنی اور اخلاقی تربیت کا فریضہ ادا کر رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موسیقی روح کی غذا ہے۔ اِس مقولے کی صداقت دیکھنا ہو تو قوالی وہ واحد صنف ہے جو روح کے لیے غذا کا کام کرتی ہے۔

برصغیر پاک وہند میں قوالی کا آغاز تیرہویں صدی میں سلاطینِ دلی کے دور میں تقریباً سات سو سال پہلے ہوا۔ حضرت امیر خسرو کو قوالی کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے اپنے پیر ومرشد حضرت نظام الدین کی آشیر باد سے سماع کو قوالی میں تبدیل کیا۔ آپ نے کئی باکمال کلام لکھے۔ آپ کی تقلید میں حضرت امیر خسرو کے دور میں ہی کئی قوال پارٹیاں وجود میں آچکی تھیں جو ہندوستان کے قریہ قریہ، گاؤں گاؤں، شہر شہر اصلاحی پیغامات کی شکل میں اسلامی تعلیمات کا پرچار کرتی رہیں۔

اِنہی کمال خاندانوں میں ایک خاندان دِلی خاندان کے نام سے مشہور ہوا۔ اِس خاندان کا بچہ بچہ قوالی میں ماہر تھا۔ اِس لیے لوگ اِسے قوال بچوں کا گھرانہ بھی کہتے تھے۔ یہ خاندان اپنے فن کو نسل در نسل منتقل کرتا رہا۔ حتیٰ کہ ہندوستان میں انگریزوں کی غلامی سے نجات کے لیے تحریکِ آزادی شروع ہوئی اور مسلمانوں نے اپنے لیے الگ وطن کا مطالبہ کیا۔ اِس تحریکِ آزادی کے نتیجے میں تقسیمِ ہند ہوئی اور یہ خاندان بھارت کے ضلع جالندھر سے ہجرت کر کے پاکستان کے صوبہ پنجاب کے شہر لائل پور (فیصل آباد) آن آباد ہوا اور یہاں کے مشہور گھنٹہ گھر کے آٹھ بازاروں میں سے ایک بازار جسے جنگ بازار کہتے ہیں، کے ریگل سینما چوک بالمقابل دربار بابا لسوڑی شاہ صاحب رہائش اختیار کی۔ پاکستان نقل مکانی کے بعد بھی یہ قوال بچوں کا یہ گھرانہ اپنے جدی پشتی فنِ قوالی سے جڑا رہا اور شہر میں خوب مقام اور نام بنایا۔ اِس قوال گھرانے کے سربراہ کا نام تھا اُستاد فتح علی خان جو اپنے دور کے بہت بڑے اور نامی گرامی قوال تھے، اُن کی قوالی کی شہرت صرف پاکستان تک محدود نہ تھی بلکہ ہندوستان اور افغانستان تک اُن کا شہرہ تھا۔ 13 اکتوبر 1948ء میں اُستاد فتح علی خان کے گھر ایک چاند سے بیٹے نے پیدائش ہوئی۔ گھر والوں نے اُس کا نام پرویز رکھا اور سب گھر والے اسے پیار سے پپّی پکارتے تھے۔ یہ خاندان ایک روحانی بزرگ پیر غلام غوث صمدانی صاحب کا پیرو تھا۔ ایک مرتبہ پیر صاحب اُستاد فتح علی خان کی دعوت پر اُن کے گھر تشریف لائے۔ اُستاد فتح علی خان نے اپنے بیٹے کا تعارف کروایا اور بتایا کہ اُن کے بچے کا نام پرویز ہے۔ یہ سُن کر پیر صاحب نے گھر والوں کو تجویز دی کہ بچے کا نام تبدیل کر دیا جائے کیونکہ خسرو پرویز ایران کے اُس بادشاہ کا نام تھا جس کو رسول اللہ ﷺ نے دعوتِ اسلام کے لیے خط لکھا مگر اُس نے خط کو پھاڑ کے پھینک دیا اور گستاخانہ الفاظ ادا کیے اور جب نبی کریم ﷺ کو خسرو پرویز کے اِس عمل کی خبر ہوئی تو آپ نے اُس کے حق میں بددعا کی اور کچھ عرصہ بعد وہ بدبخت اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اُستاد فتح علی خان نے پیر صاحب کی اِس تجویز کو منظور کر لیا اور تبدیلئ نام کی ذمہ داری بھی پیر صاحب کو سونپ دی۔ پیر صاحب نے غور وخوض کے بعد بچے کا نام نصرت تجویز کیا جس کا مطلب ہے فتح اور کامیابی کا راستہ۔ اِس طرح بچے کا نام پرویز فتح علی سے نصرت فتح علی رکھ دیا گیا۔ پھر اُس بچے نے فتح و نصرت کے وہ جھنڈے گاڑے کہ دنیا معترف ہوگئی۔ اُستاد فتح علی خان نے ایک محب باپ کی طرح اپنے بیٹے کے اعلیٰ مستقبل کے سہانے خواب آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے کیونکہ اُنہیں احساس تھا کہ ہمارے معاشرے میں گلوکاروں اور فنکاروں کو وہ مقام نہیں ملتا جو ڈاکٹروں، انجینئرز اور سرکاری افسران کو ملتا ہے۔ اِس لیے وہ نصرت کو گانے بجانے سے دور رکھتے اور اُسے پڑھائی پر توجہ مرکوز رکھنے کی نصیحت فرمادی مگر قدرت نے جس مقصد کے لیے نصرت کو چن لیا تھا۔ وہ مادہ اُس کے اندر بچپن ہی سے موجود تھا۔ نصرت باپ سے چھپ کر طبلہ اور ہارمونیم سیکھتا رہا۔ ایک دن اُن کے والد نے اُسے طبلہ بجاتے دیکھا تو اُس کے مہارت کو دیکھ کر دھنگ رہ گئے اور اِس طرح وہ نصرت کو ڈاکٹر بنانے کے ارادے سے دستبردار ہو گئے اور اپنی نگرانی میں بیٹے کی فنی تربیت کرنے لگے اور دن بدن نصرت کی صلاحیتیں نکھرتی گئیں اور جلد ہی اُس نے طبلہ نوازی پر عبور حاصل کر لیا۔

نصرت فتح علی خان کے ماموں اُن کے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد کلاسیکی موسیقی میں یدِ طولیٰ رکھنے والے موسیقار اور گائیک اُستاد بڑے غلام علی خان کے صاحبزادے اُستاد منور خان بھارت سے پاکستان تشریف لائے تو اُستاد فتح علی خان کے گھر ملاقات کے لیے پہنچے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ مجھے پاکستان میں گانے کا مزہ نہیں آتا کیونکہ یہاں کوئی اچھا طبلہ بجانے والا نہیں ہے۔ اُستاد فتح علی خان مسکرا کر کہنے لگے "منور خان صاحب آپ اپنا گانے کا شوق فرمائیں، میرا بیٹا آپ کو مایوس نہیں کرے گا"۔ جب اُستاد منور خان نے نصرت کی سنگت میں گانا مکمل کیا تو خوب تعریف کرنے لگے اور کہا کہ "فتح علی خان تمہارا بیٹا عمر میں چھوٹا مگر فن میں پورا اُستاد ہے"۔

نصرت فتح علی خان چودہ پندرہ سال کی عمر میں طبلہ ہارمونیم اور دوسرے ساز بجانا بہت اچھے طریقے سے سیکھ گئے تھے اور طبلہ نوازی میں تو بڑے بڑے اساتذہ سے دادِ فن پا چکے تھے مگر اُن کی آواز کا بھاری پن اُن کی ایک اچھا گلوکار بننے کی راہ میں رکاوٹ تھا۔

اِسی وجہ سے نصرت فتح علی خان کا دھیان گلوکاری کی طرف بالکل نہیں تھا پھر اچانک ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ نصرت کے والد اُستاد فتح علی خان اُنہیں داغِ مفارقت دے کر اِس جہانِ فانی سے کوچ فرما گئے۔ پھر ایک رات یہ ہوا کہ نصرت باپ کی جدائی کے غم میں روتے روتے سو گئے اور وہ خواب میں دیکھتے ہیں کہ اُن کے والد سفید پاجامہ کُرتا پہنے اُن کا ہاتھ پکڑ کر اُنہیں ایک دربار میں لے جاتے ہیں اور اُن کے منہ میں کوئی رس بھری چیز ڈال کر کہتے ہیں میرے ساتھ مل کر گاؤ۔ نوعمر نصرت اپنے والد کے ساتھ گانا شروع کر دیتے ہیں اور جب اُن کی آنکھ کھلی تو اُن کی زبان پر وہی کلام تھا جو خواب میں والد صاحب کے ساتھ گا رہے تھے۔ اِس خواب کا ذکر وہ اپنے چچا مبارک علی خان سے کرتے ہیں تو چچا کہتے ہیں کہ جس دربار کی تم منظر کشی کر رہے ہو وہ تو خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کا دربار ہے۔ حالانکہ نصرت نے اُس وقت تک خواجہ معین الدین چشتی کا دربار بچشمِ خود نہیں دیکھا تھا مگر مبارک علی خان دربار پر حاضری دے چکے تھے اِس لیے فوراً جان گئے کہ کہ اصل اشارہ کیا ہے۔ اِس مبارک خواب کے بعد نصرت کے اندر گانے کی ترنگ انگڑائیاں لینے لگی اور اُنہوں نے پہلی بار اپنے والد کے چہلم پر بطور گائیک پرفارم کیا۔ اِس گائیکی میں اگرچہ فنی نقائص تو تھے مگر نصرت کے سوز و گداز اور پُرغم لب ولہجہ نے ہر سننے والے کو اشکبار کر دیا۔ نصرت کے دونوں چچا مبارک علی خان اور سلامت علی خان جان چکے تھے کہ اُن کے بھتیجے میں اپنے باپ کی جگہ لینے کی مکمل صلاحیت موجود ہے۔ اِس لیے اُنہوں نے نصرت فتح علی خان کی تربیت کا خود ذمہ لے لیا۔ محنت، لگن اور ریاضت سے نصرت ایک ایسا تراشا ہوا انمول ہیرا بن گیا کہ آسمانِ موسیقی پر آفتاب و مہتاب کی طرح چمکنے لگا۔

نصرت فتح علی خان کو پہلی بار 23 مارچ 1965ء یومِ پاکستان کے موقع پر ریڈیو پاکستان میں جشنِ بہاراں میوزیکل فیسٹیول میں گانے کا موقع ملا اور اُن کا فن تنقید اور تعریف کی زد میں آیا اور وہ پاکستان کے ٹاپ کلاس گلوکاروں کی نظر میں آگئے۔ 1971ء میں اپنے چچا مبارک علی خان کی وفات کے بعد نصرت فتح علی اپنے خاندان کی قوال پارٹی کے سربراہ مقرر ہوئے اور اِن لمحات نے اُن کی عالمگیر پہچان کے لیے بنیاد فراہم کی اور ہواؤں کے دوش پر اُن کی سرحد پار شہرت پہنچ گئی۔ اُنہیں ملک سے باہر جانے کا موقع 1979ء میں اُس وقت ملا جب بالی وڈ کے آئیکونک ہیرو راج کپور نے اپنے بیٹے رشی کپور کی شادی پر اُنہیں پاکستان سے گانے کے لیے مدعو کیا۔ اِس شادی میں ہندوستان کے نامور گلوکار، موسیقار، ڈائریکٹرز، پروڈیوسرز اور اداکار موجود تھے۔ سبھی حیران تھے کہ ہندوستان میں بڑے نامور گائیکوں کی موجودگی میں پاکستان سے قوال پارٹی کو کیوں بلا لیا گیا۔ ہر خاص و عام سوال اُٹھا رہا تھا مگر شام کو محفلِ موسیقی سجی اور نصرت نے پرفارم کرنا شروع کیا تو ہر ناقد، معترض تعریف کرنے لگا اور یوں ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز نصرت کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے جتن کرنے لگے مگر اُس سے قبل ہی 1980ء میں انٹرنیشنل میوزک کمپنی اورینٹل اسٹار ایجنسیز Oriental star agencies)) نے نصرت سے ایک معاہدہ کر لیا۔ اِس کے بعد نصرت فتح علی خان نے دنیا بھر کی میوزک کمپنیوں اور فلموں میں میوزک دینا شروع کر دیا۔ آپ نے یورپی ممالک کے علاوہ ہندوستان، جاپان، انگلینڈ، امریکہ اور پاکستان سمیت تقریباً 40 ممالک میں ذاتی طور پر پرفارم کیا۔ یا میوزک کمپوزیشنز دیں اور بیسیوں البم ریکارڈ کروائے۔ مغربی موسیقاروں کے ساتھ تعاون سے مشرقی اور مغربی موسیقی کو ہم آہنگ کر کے Fusion سے فنِ موسیقی کو نئے حدود پر استوار کیا جس کی تقلید آج دنیا بھر کے گلوکار اور موسیقار کر رہے ہیں۔ 1980ء سے 1984ء تک نصرت دنیا میں میوزک انڈسٹری میں بڑا عالمی شہرت یافتہ نام بن چکا تھا اور دنیا اُسے ایک بڑے موسیقار کے حوالے سے جان چکی تھی مگر جب 1985ء میں نصرت فتح علی خان نے بطور قوال ورلڈ آف میوزک آرٹس اینڈ ڈانس فیسٹیول لندن میں پرفارم کیا تو وہ گورے جو پوپ، جاز اور ہپ ہاپ میوزک کے دلدادہ تھے، کُرتے پجاموں اور واسکٹ پہنے سادہ لوح لوگوں کو دیکھ کر حیران تھے کہ یہ لوگ کیا کروانے والے ہیں مگر جب نصرت فتح علی خان نے تال میل درست کرنے کے بعد ہارمونیم بجانا شروع کیا اور قوالی اللہ ہو پڑھنا شروع کی تو کچھ گورے گوریوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ کچھ جھومنے لگے اور باقیوں کی زبان سے ورد جاری ہوا "اللہ ہوا، للہ ہو، اللہ ہو"۔ باقیوں کی 45 منٹ کی پرفارمنس چار گھنٹے تک جاری رہی۔ 1988ء میں جب نصرت فتح علی خان نے Martin Scorsese's کی فلم Last templation of christ کے لیے Peter Gaberail کے ساتھ مل کر ساؤنڈ ٹریک تیار کیا تو اُن کی شہرت امریکہ تک جا پہنچی۔ Peter Gaberail کے ساتھ اُن کی لمبی شراکت Gaberial's real world records تک چلی۔ 1990ء میں نصرت فتح علی خان نے کینیڈین گٹارسٹ مائیکل بروک کے ساتھ "مست مست" البم ریکارڈ کیا۔ اِس کی خاصیت یہ تھی کہ اِس نے مشرقی روایتی صوفی آوازوں کو ویسٹرن راک کے فیوژن سے موسیقی کی دُھنوں کو اِس انداز میں ترتیب دیا کہ دنیا اِس ناز و ادا کی دیوانی ہو گئی اور اِس البم نے فروخت کے سب سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے۔ اِس کے بعد خان صاحب نے کئی مغربی موسیقاروں اور گلوکاروں کے تعاون سے نت نئے تجربات کیے اور کامیاب رہے۔ 1995ء میں ایک بار پھر نصرت نے ایک انگلش مووی کے لیے ساؤنڈ چیک دیا مگر اِس بار دنیائے فلم کی سب سے بڑی فلم انڈسٹری ہالی وڈ Hollywood تھی اور فلم تھی "ڈیڈ مین واکنگ Dead Man walking"۔ اِس کے ہدایت کار مشہورِ زمانہ Pearl Iam's Eddie Vedder تھے اور اُسی سال فتح علی خان نے ایک اور ہالی وڈ فلم Natural born killers میں بھی بیک گراؤنڈ میوزک دیا۔

1997ء میں بھارت کے مشہور مسلمان موسیقار اے آر رحمان نے ایک میوزک البم گروپ پیس ریلیز کیا جس میں خان صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اُن کا کلام "اللہ ہو" شامل کیا اور اُن کی وفات کے بعد ایک گانا "تیرے بن خان صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے خاص طور پر تیار کیا۔

خان صاحب نے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل پاکستانی فلموں کے لیے بھی میوزک دیا۔ اُنہوں نے کئی بالی وڈ فلموں "اور پیار ہو گیا، کارتوس، دل لگی، دھڑکن (جو 2000ء میں ریلیز ہوئی) اور کچے دھاگے فلم 1999ء میں اُن کی وفات کے دو سال اور تین سال کے بعد بالترتیب ریلیز ہوئی تھیں۔

نصرت فتح علی خان کو قوالی کی تاریخ کا عظیم قوال مانا جاتا ہے۔ آپ کو حکومتِ پاکستان نے 1987ء میں صدارتی تمغہ برائے حُسنِ کارکردگی عطا کیا۔ 1995ء میں یونیسکو میوزک پرائز سے نوازا گیا۔ پاکستان ٹیلی ویژن نے آپ کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ آپ کو پیرس، جاپان اور جرمنی کے آرٹ اینڈ میوزک ایوارڈ بھی ملے۔ آپ نے اپنی زندگی میں 125 قوالیوں کے البم ریکارڈ کروائے اور آپ کا نام گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج ہے۔ 2010ء میں سی این این کی رپورٹ میں گزشتہ 50 سالوں کے پہلے 20 بہترین موسیقاروں میں آپ کا شمار کیا گیا۔ جاپان میں اُنہیں Singing Buddha، لاس اینجلس میں جنت کی آواز Voice of Paradise، لندن میں سپرٹ آف اسلام Spirit of Islam اور پاکستان میں شہنشاہِ قوالی Emperor of Qwalis کہا جاتا ہے۔

پیدائش اور موت کے درمیانی وقت کو زندگی کہا جاتا ہے۔ اِس دنیا میں جو بھی آیا اُسے بالآخر مرنا ہے اور نصرت فتح علی خان پر بھی وہ وقت آیا جو موت کی شکل میں اُسے ساتھ لے گیا۔ کام کی زیادتی کے باعث بدقسمتی سے نصرت فتح علی خان بہت زیادہ بیمار ہو گئے تھے۔ اُن کو جگر اور گردے کے امراض لاحق ہو چکے تھے۔ اُنہیں علاج معالجہ کی غرض سے بیرونی ملک انگلینڈ لے جایا گیا تھا مگر ایئرپورٹ پر ہی اُن کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ اُنہیں جلدی سے Cromwell Hospital پہنچایا گیا جہاں اُنہیں اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ 16 اگست 1997ء کو وفات پا گئے۔ اُن کی ڈیڈ باڈی کو فیصل آباد لایا گیا جہاں ہزاروں چاہنے والوں نے جنازے میں شرکت کی۔ اُنہیں کبوتروں والا قبرستان جھنگ روڈ میں دفنایا گیا۔

آج شہنشاہِ قوالی اُستاد نصرت فتح علی خان ہمارے درمیان نہیں مگر اُن کی آواز ہمیشہ ہمارے کانوں میں رس گھولتی رہے گی اور وہ اپنے چاہنے والے دنیا بھر کے کروڑوں انسانوں کے دلوں میں زندہ رہیں گے۔ خدا اُن کی مغفرت فرمائے، آمین۔

بشکریہ ریڈیو پاکستان فیصل آباد

ہم کو جگنوؤں کے تتلیوں کے دیس جانا ہے۔۔۔ منفرد گلوکارہ نیرہ نور کی زندگی کا احوال۔۔۔جن کی برسی 20 اگست کو منائی جاتی ہے۔

تحریر۔ سجاد احمد بری

دیکھنے میں دھان پان سی۔ سادہ لباس۔ کوء آرائش وزیبائش نہیں مگر ایک سادگی ایک، وقار جواُن کی شخصیت میں جھلکتا تھا۔ کچھ ایسا ہی رنگ وروپ اُن کی دھیمی اور کومل آواز میں بھی تھا۔ ہر وقت ایک سادہ سی مسکراہٹ اُن کے چہرے پہ کھیلتی رہتی۔ بہت کم گو دھیما مزاج لیکن اپنی آواز کو سُر دیتیں تو ایک سماں باندھ دیتیں۔ ایک ایسا سماں کہ جس میں باقی ساری آوازیں چپ ہو جاتیں اور بس اُنہی کی جادو اثر آواز اپنا جادو جگاتی۔ اِک عجب طلسم اور منفرد رنگ و آہنگ جو صرف اُنہی کی پہچان بنا آج بھی اُن کے مداحوں کو اُن کا اسیر کئے ہوئے ہے۔

یہ تذکرہ ہے اپنے نام کی طرح گائیکی کے نور میں ڈھلی ایک سنہری آواز نیرہ نور کا۔۔۔ جنہیں بلبلِ پاکستان بھی کہا جاتا ہے۔

نیرہ نور کا جنم 3 نومبر 1950ء کو آسام انڈیا کے شہر گوہاٹی میں ہوا۔ اُن کا خاندان تاجر پیشہ تھا جو اُس سے پہلے امرتسر میں آباد تھا۔ نیرہ نور کے والد مسلم لیگ کے ایک متحرک کارکن تھے۔ قائدِ اعظمؒ جب بھی گوہاٹی آتے تو اُنہی کے گھر قیام کرتے۔ ایسے خاندانی پسِ منظر میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اِس گھر کا کوئی بھی فرد اپنے لئے گائیکی کا انتخاب کرے۔

نیرہ نور بتایا کرتی تھیں کہ اُن کے گھر کے قریب واقع ایک مندر میں بجتی گھنٹیاں اور وہاں بھجن گاتی لڑکیوں کی آوازیں اُنہیں اپنی طرف کھینچتیں۔ وہ خود کو روک نہ پاتیں اور وہاں جا کر پہروں اُن کو سنتیں۔ قدرت کم سن نیرہ نور کے لئے سُر جہان تخلیق کر رہی تھی۔ نیرہ نور کی عمر 7 برس تھی جب وہ اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان آ گئیں۔ اُنہوں نے گائیکی کی باقاعدہ تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ ریڈیو سے نشر ہونے والی موسیقی نے ہی اُنہیں ابتدائی اسباق دیئے۔ اُن میں گلوکاری کی خداداد صلاحیت تھی۔ فنِ گائیکی میں وہ بیگم اختر سے متاثر تھیں۔ ابتدائی طور پر اُنہوں نے اپنے دوستوں کی محافل میں گایا۔

نیرہ نور کو دریافت کرنے کا سہرا اسلامیہ کالج لاہور کے ایک موسیقار پروفیسر اسرار کے سر جاتا ہے جنہوں نے 1968ء میں نیرہ نور کو نیشنل کالج آف آرٹس لاہور کے سالانہ عشائیہ میں گاتے ہوئے سنا جہاں کی وہ طالبہ تھیں اور یہ پروفیسر اسرار ہی تھے جو اُنہیں ریڈیو لاہور لے گئے۔ پی ٹی وی لاہور کے سابق میوزک پروڈیوسر خواجہ نجم الحسن کے بقول 1969ء میں ریڈیو پاکستان کے لئے اُن کی آوازوں کے آڈیشن ہو رہے تھے۔ ملکۂ موسیقی روشن آراء بیگم اور اُستاد امانت علی خان نئی آوازوں کا انتخاب کرنے والی ٹیم میں شامل تھے۔ روشن آراء بیگم نے نیرہ نور کو سنا۔ پسند کیا۔ اُنہوں نے نیرہ سے کہا کہ ماشاءاللہ تمہارے گلے میں بہت مرکیاں ہیں۔ تمہارے اُستاد کون ہیں۔ نیرہ نے جواب دیا کہ ہمارے گھر میں ایک گراموفون تھا جس پر میں اُس زمانے کی معروف گلوکاروں کملا جھریا، کانن دیوی اور بیگم اختر کے ریکارڈ بار بار سنتی تھی۔ میں جو کچھ سیکھی ہوں سُن سُن کر سیکھی ہوں۔

خواجہ نجم الحسن نے انہیں اپنے ٹی وی پروگرامز "سخن ور، اندازِ بیاں، میری پسند اور دنیا میری جواں" کے لئے گوایا۔ اِن کے علاوہ اُنہوں نے شعیب ہاشمی کے پروگرامز "سچ گپ اور ٹال مٹول" کے لئے بھی گایا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک سادہ سی لڑکی چادر اوڑھ کر فرش پر بیٹھ کر گاتی ہے تو اُن کی منفرد آواز و انداز نے فوری طور پر لوگوں کی توجہ حاصل کر لی۔ یوتھ فیسٹیول اور اوپن ائیر تھیٹر لاہور میں گانے کے بعد اُنہیں گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ اِس حوصلہ افزائی نے اُن پر گائیکی کے میدان میں آگے بڑھنے کے در کھول دیئے۔

اُنہیں شاعری کا بھی عمدہ ذوق تھا اور اُن کا تلفظ بھی شاندار تھا۔ وہ گیتوں اور غزلوں کی روح سے بخوبی آشنا تھیں۔ غالب، ناصر کاظمی، ابنِ انشائ، فیض احمد فیض اور بہزاد لکھنوی کے کلام نے انہیں خوب شہرت بخشی۔

معروف شاعر احمد ندیم قاسمی کہا کرتے تھے کہ آزاد نظم کو نیرہ نور سے بہتر کوئی نہیں گا سکتا۔ فلم "شیریں اور فرہاد" کے لئے مہان موسیقار خواجہ خورشید انور نے اُنہیں بلوایا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ وہ لمحہ اُن کے لئے فخر کا لمحہ تھا۔ نیرہ نور نے پاکستان فلم انڈسٹری کو بھی یادگار اور سُپر ہٹ نغمے دیئے۔

1973ء میں ریلیز ہونے والی فلم گھرانہ اور فلم تان سین سے اُن کی فلمی گائیکی کے سفر کا آغاز ہوا۔ فلم گھرانہ کے لئے معروف شاعر کلیم عثمانی کے لکھے ہوئے گیت "تیرا سایہ جہاں بھی ہو سجناں" سے اُنہوں نے فلمی میدان میں قدم رکھا۔ کلیم عثمانی بتایا کرتے تھے کہ فلم میں اُن کا نیرہ نور کی آواز کو متعارف کرانا خود اُن کے نزدیک ایک اہم ترین کارنامہ ہے اور فلم اسٹار محمد علی فلم گھرانہ کی بے مثال کامیابی کا کریڈٹ نیرہ نور کے گائے ہوئے اِس گیت کو دیا کرتے تھے۔

نیرہ نور نے مہدی حسن، احمد رشدی، عالمگیر اور اخلاق احمد جیسے بڑے گلوکاروں کے ساتھ متعدد دوگانے بھی گائے۔۔ اُن کی ایک اور پہچان اُن کے گائے ہوئے ملی نغمے بھی ہیں خاص طور پر "وطن کی مٹی گواہ رہنا، اِس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں" اور "جو نام وہی پہچان پاکستان پاکستان" تو اُن کی پہچان بن گئے۔ نیرہ نور کی یادگار فلموں میں "گھرانہ، شیریں فرہاد، مستانہ، بھول، اجنبی، فرض اور مامتا، دوساتھی، آئینہ، بندش، آس، پھول میرے گلشن کا، پردہ نہ اٹھاؤ، نہیں ابھی نہیں، بوبی اینڈ جولی اور آہٹ" قابلِ ذکر ہیں۔ نیرہ نور نے خواجہ خورشید انور، ایم اشرف، کمال احمد اور روبن گھوش جیسے باکمال موسیقاروں کی تربیت دی گئی دُھنوں پر گیت گائے۔

1992ء میں پیش کئے جانے والے ٹی وی ڈرامے زیب النساء کے لئے احمد فراز کی لکھی ہوئی نظم "خواب مرتے نہیں" اُن کا آخری گیت ثابت ہوا اور وہ گلوکاری سے کنارہ کش ہو گئیں۔ اُن کو ملنے والے اعزازات کی بات کی جائے تو اُنہیں 1973ء میں نگار ایوارڈ اور 2006ء میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے صدارتی تمغہ برائے حُسن کارکردگی سے نوازا گیا۔

وفات سے چند سال قبل ہی اُنہوں نے گائیکی کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ نیرہ نور ایک طویل عرصہ کینسر کے مرض میں مبتلا رہنے کے بعد 20 اگست 2022ء کو کراچی میں انتقال کر گئیں۔ ریڈیو پاکستان سُر جہان کی اِس سریلی آواز کی فنی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

بشکریہ پی بی سی بہاولپور

نازیہ حسن

تحریر: مقصود گوہر

نازیہ حسن کی پیدائش تین مارچ 1965ء کو کراچی میں ہوئی۔ نازیہ حسن کے والد بشیر احمد حسن کراچی کے متمول تاجر تھے۔ خاصا خوشحال گھرانہ تھا۔ نازیہ حسن کی والدہ ہاؤس وائف ہونے کے ساتھ ساتھ سوشل ورکر بھی تھیں اور اُنہیں میوزک کا شوق بھی تھا۔ کلاسیکل گائیک اُستاد امیر احمد خاں سے موسیقی کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ جب اُستاد نازیہ کی والدہ کو موسیقی کا سبق دے رہے ہوتے تو وہ اُن کے پاس بیٹھی ہوتی تھی۔ یوں آہستہ آہستہ اپنے آپ وہ موسیقی کے قریب ہوتی گئی اور پھر باقاعدہ گائیک بننے کی راہ پر چل پڑی۔ اِس سلسلے میں اُن کی والدہ نے پورا ساتھ دیا۔ نازیہ حسن کا موسیقی کی دنیا میں داخلے کا کریڈٹ موسیقار سہیل رعنا کو بھی جاتا ہے۔ نازیہ حسن کے کیریئر کا آغاز موسیقار سہیل رعنا کے پروگرام "گیتوں کی مالا" سے ہوا۔ اِس پروگرام میں اُنہوں نے پہلا گانا "دوستی" گایا، جو بے حد مقبول ہوا۔ کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ محض 10 برس کی بچی اتنا اچھا گا سکتی ہے۔ سہیل رعنا نازیہ حسن کا نام بڑے فخر سے لیا کرتے تھے کہ وہ میری شاگرد ہے۔'

80ء کی دہائی نازیہ حسن کی زندگی کا خوبصورت دور تھا۔ ایک طرف اُس نے تعلیم مکمل کی، دوسری طرف میوزک کی دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک کامیابی حاصل کی اور عالمی اداروں کے ساتھ سماجی فلاح کے لیے کام بھی کیا۔ ساتھ ساتھ میوزک کے لیے بھی کام ہوتا رہا۔

نازیہ نے اپنے میوزک کے سفر میں اپنے بھائی زوہیب کو بھی شامل کر لیا اور اور بڈو کے ساتھ مل کر 1981ء میں اپنا پہلا باقاعدہ البم "ڈسکو دیوانے" ریلیز کیا۔ یہ البم بھی میوزک کی دنیا میں ایک بڑا دھماکہ تھا۔ پہلی دفعہ کسی پاکستانی سنگر کے گانوں کو برٹش چارٹ میں جگہ ملی۔ بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش اور برازیل سمیت 14 ممالک میں اِس البم کی چھ کروڑ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ پھر ڈسکو دیوانے کا انگلش ورژن بھی ریلیز کیا گیا۔ صرف 12 برسوں میں نازیہ حسن کے پانچ البم ریلیز ہوئے، جن میں ڈسکو دیوانے، بوم بوم، ینگ ترنگ، ہاٹ لائن اور کیمرہ کیمرہ شامل تھے۔ نازیہ حسن کو فلم فیئر ایوارڈ کے ساتھ ساتھ گولڈن ڈسک ایوارڈ اور پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

نازیہ حسن نے کئی گیت خود لکھے اور زوہیب حسن کے ساتھ مل کر اُنہیں کمپوز کیا۔ 1986ء میں نازیہ حسن نے بھارتی فلم بلوان کے لیے کشور کمار کے ساتھ بھی ایک گانا ریکارڈ کروایا جس کے موسیقار بپی لہری تھے۔ نازیہ حسن انتہائی اصول پسند اور محب وطن تھیں، اِسی اصول پسندی اور حبُ الوطنی کے سبب اُنہوں نے اپنے محسن "بڈو" کے ساتھ گانے سے انکار کر دیا تھا۔ جس پر بڈو سکتے میں آ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ نازیہ اُسے بھی انکار کر سکتی ہے۔ ہوا یہ کہ ایک گانا ریکارڈ کرانا تھا "میڈ اِن انڈیا" جس کی تھیم یہ تھی کہ ایک لڑکی کو بہت سی خوبیوں والے لڑکے کی تلاش میں تھی جس سے وہ شادی کر سکے مگر وہ انڈیا سے ہو۔ بڈو نے یہ دُھن نازیہ حسن کو سامنے رکھ کر کمپوز کی تھی۔ جب نازیہ حسن نے گانے کی تھیم دیکھی تو اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا بڈو صاحب میں پہلے پاکستانی ہوں بعد میں کچھ اور ہوں۔ آپ کا احترام اپنی جگہ مگر میں یہ گیت کسی قیمت پر نہیں گا سکتی۔ بڈو کو اِس بات کا دکھ ہوا۔ اُس کے بعد دونوں کی راہیں بھی جدا ہو گئیں۔ بعد میں یہ گانا اُنہوں نے علیشا چنائی کی آواز میں ریکارڈ کیا۔

نازیہ حسن کی عمر بظاہر 35 سال تھی مگر اتنے مختصر عرصے میں وہ 100 سال والا کام کر گئیں۔ یہی وجہ ہے آج بھی اُن کے گیتوں کی گونج سنائی دیتی ہے، لوگ اُنہیں یاد کرتے ہیں۔ نازیہ حسن کے مقبول گیت "آپ جیسا کوئی، ڈسکو دیوانے، ڈم ڈم ڈی ڈی اور دوستی" تھے۔ مگر نازیہ حسن کا اپنا پسندیدہ گیت "ٹالی دے تھلے بہہ کے کریے پیار دیاں گلاں" تھا۔

نازیہ حسن کے آخری الفاظ تھے "مرنا تو سبھی نے ہے، میں سمجھتی ہوں مجھے ابھی نہیں مرنا تھا۔

بشکریہ پی بی سی لاہور

آواز

تحریر: شاہد اللہ خان

مجھے اپنی آواز کبھی پسند نہیں آئی۔

یہ اعتراف میں کسی خاص بہادری کے ساتھ نہیں کر رہا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اپنی آواز کے بارے میں یہ فیصلہ کرنے میں مجھے کئی سال لگے کہ مسئلہ میری آواز میں ہے یا میری سماعت میں۔ آخر کار میں نے طے کیا کہ دونوں میں کچھ نہ کچھ خرابی ضرور ہے، کیونکہ دنیا کے لوگ میری آواز سُن کر مجھے پہچان لیتے ہیں، صرف میں ہی ایسا شخص ہوں جو اپنی آواز سُن کر پہلے یہ سوچتا ہے کہ یہ آدمی کون ہے؟

پہلی بار جب میں نے اپنی آواز ریکارڈ شدہ صورت میں سُنی تو مجھے شدید حیرت ہوئی۔ میں نے موبائل کی طرف دیکھا، پھر اپنے ارد گرد دیکھا، جیسے کسی نے میرے ساتھ مذاق کیا ہو۔ ریکارڈنگ دوبارہ چلائی۔ آواز وہی تھی۔ تیسری بار سُنی تو شک یقین میں بدل گیا کہ دنیا مجھے جس آواز میں سنتی ہے، میں خود اُس آواز میں کبھی نہیں بولتا۔

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان ساری عمر اپنی آواز دوسروں کو سناتا رہتا ہے، مگر اپنی آواز سے اُس کا تعارف اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی مشین اِسے واپس لوٹا دیتی ہے۔

ہم آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں، ہاں، یہی میں ہوں۔ کبھی تصویر اچھی آجائے تو فوراً محفوظ کر لیتے ہیں، اور کبھی خراب آجائے تو فوٹو گرافر، کیمرہ، روشنی اور موسم تک کو موردِ الزام ٹھہرا دیتے ہیں۔ لیکن آواز کے معاملے میں ہمارا اعتماد اچانک ختم ہو جاتا ہے۔

"یہ میری آواز تو نہیں!"

یہ جملہ تقریباً ہر شخص نے اپنی پہلی ریکارڈنگ سُن کر کہا ہوگا۔ پھر ہم اپنے آپ کو سمجھاتے ہیں کہ موبائل میں آواز بدل جاتی ہے، مائیک اچھا نہیں تھا، ریکارڈر میں مسئلہ ہے، کمرے کی گونج زیادہ تھی۔ کبھی کبھی تو ہم اتنی تفصیل سے تکنیکی وجوہات بیان کرتے ہیں کہ لگتا ہے ابھی کسی بین الاقوامی کانفرنس میں صوتی لہروں پر مقالہ پڑھنے والے ہیں۔

حالانکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی ہی آواز اجنبی لگتی ہے۔

مجھے یاد ہے، جب میں نے پہلی بار باقاعدہ مائیک کے سامنے اپنی آواز سُنی تو میرے اندر ایک عجیب سی بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ میں نے سوچا، لوگ مجھے اِسی آواز میں سنتے ہیں؟ پھر ایک دوسرا خیال آیا، اگر واقعی لوگ مجھے اِسی آواز میں سنتے ہیں تو اُنھوں نے اب تک شکایت کیوں نہیں کی؟ یہ سوال زیادہ خطرناک تھا۔

میں ریڈیو سے وابستہ ہوں، اِس لیے آواز سے میرا تعلق ذرا پرانا اور ذرا پیچیدہ ہے۔

کسی کی آواز میں اعتماد ہوتا ہے، کسی میں گھبراہٹ، کسی میں ایسی مٹھاس کہ آدمی بات ختم ہونے کے بعد بھی کچھ دیر سنتا رہنا چاہتا ہے۔ اور بعض آوازیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں سُن کر انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ بولنے والے نے اپنے گھر میں بھی کبھی خاموشی کو موقع نہیں دیا ہوگا۔

مائیک بڑا بے رحم آلہ ہے۔ یہ آپ کے چہرے کی معمولی خامیاں معاف کر سکتا ہے، آپ کے کپڑوں اور بالوں سے اِسے کوئی غرض نہیں، لیکن آواز میں ذرا سا جھوٹ، ذرا سی مصنوعی مسکراہٹ ہو تو فوراً پکڑ لیتا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ دیکھا ہے کہ آدمی عام گفتگو میں بہت اچھا بولتا ہے، لیکن جیسے ہی مائیک سامنے آتا ہے، اُس کی زبان کو اچانک اپنے وجود پر شک ہونے لگتا ہے۔

عام زندگی میں ہم کہتے ہیں:

"بھائی، کیا حال ہے؟"

مائیک کے سامنے:

"محترم سامعین، اُمید ہے کہ آپ جہاں کہیں بھی ہیں، صحت و عافیت کے ساتھ ہماری اِس بامقصد نشست سے محظوظ ہو رہے ہوں گے۔"

مجھے کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ مائیک انسان کے اندر چھپا ہوا سرکاری افسر باہر نکال دیتا ہے۔

لیکن آواز کا اصل کمال مائیک میں نہیں، یاد میں ہے۔ کچھ آوازیں انسان سنتا نہیں، محفوظ کر لیتا ہے۔

ماں کی آواز بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔

بچپن میں ہمیں اِس کی قدر معلوم نہیں ہوتی۔ وہ آواز گھر کے باقی شور میں شامل رہتی ہے، کبھی کھانے کے لیے بلاتی ہے، کبھی ڈانٹتی ہے، کبھی کہتی ہے، جلدی سو جاؤ۔ اُس وقت ہمیں لگتا ہے کہ یہ آواز ہمیشہ رہے گی۔

پھر ایک دن انسان بڑا ہو جاتا ہے اور اُسے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کچھ آوازیں ایسی بھی تھیں جنہیں وہ سننے کا عادی تھا، مگر اب اُن کے لیے اُسے یاد کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

تب سمجھ میں آتا ہے کہ آواز صرف آواز نہیں ہوتی۔ وہ ایک گھر ہوتی ہے۔ ایک زمانہ ہوتی ہے۔ ایک شخص ہوتی ہے۔ ایک ایسا دروازہ جسے ہم کھول تو نہیں سکتے، مگر اُس کے باہر کھڑے ہو کر بہت دیر تک اندر کی زندگی کو یاد کر سکتے ہیں۔

مگر میں پھر جذباتی ہو رہا ہوں۔ انشائیہ نگار کی سب سے بڑی مشکل یہی ہے کہ وہ ایک معمولی موضوع سے نکلتا ہے اور راستے میں کہیں نہ کہیں زندگی اُسے پکڑ لیتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آواز پر ہنسے، مگر آواز اُسے بچپن تک لے جاتی ہے۔

اِس لیے بہتر ہے کہ ہم دوبارہ اپنی آواز کی طرف لوٹیں۔

آخر اپنی آواز ہمیں اپنی کیوں نہیں لگتی؟ شاید اِس لیے کہ جب ہم بولتے ہیں تو اپنی آواز صرف کانوں سے نہیں سنتے، وہ ہمارے اندر بھی گونجتی ہے۔ دوسرے لوگ ہمیں باہر سے سنتے ہیں، ہم اُسے اندر سے۔ یہ فرق اتنا معمولی ہے کہ ہم نے کبھی اِس پر غور نہیں کیا، مگر اتنا بڑا بھی ہے کہ اپنی ریکارڈ شدہ آواز سنتے ہی ہمیں شک ہو جاتا ہے کہ ہماری جگہ کوئی اور آدمی بول رہا ہے۔

میں نے کئی بار اپنی ریکارڈ شدہ آواز سُن کر اِسے تنقید کی نظر سے دیکھا ہے۔ یہاں لہجہ کچھ زیادہ سخت ہے۔ یہاں لفظ کچھ زیادہ کھینچ دیا۔ یہاں آواز ذرا پتلی لگ رہی ہے۔ اور پھر ایک خطرناک خیال آتا ہے، کیا دوسروں کو بھی میں ایسا ہی سنائی دیتا ہوں؟

اِس سوال کا جواب آج تک مجھے پوری طرح معلوم نہیں۔ اور شاید یہی اچھی بات ہے، کیونکہ اگر انسان کو اپنے بارے میں ہر حقیقت معلوم ہو جائے تو زندگی میں حیرت نام کی کوئی چیز باقی نہ رہے۔

اپنی آواز سننے کے بعد میں نے دوسروں کی آوازیں زیادہ غور سے سننا شروع کر دیں۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے ساتھ صرف ایک آواز نہیں اٹھائے پھرتا، وہ اپنے اندر کئی زمانوں کی آوازیں لیے چلتا ہے۔ کسی کے لہجے میں باپ کی جھلک ہوتی ہے، کسی میں ماں کی، کسی میں اُستاد کی، کسی میں گاؤں کی۔ بعض لوگوں کے لفظ بدل جاتے ہیں، مگر اُن کی آواز میں اُن کا ماضی کہیں نہ کہیں محفوظ رہتا ہے۔

شاید اِسی لیے کچھ لوگ برسوں بعد ملیں، چہرہ اور بال بدل چکے ہوں، مگر جیسے ہی وہ کہتے ہیں، "کیا حال ہے؟" ہم فوراً پہچان لیتے ہیں۔ چہرہ ہمیں دھوکا دے سکتا ہے، آواز اکثر نہیں دیتی۔

یہ سب سوچتے سوچتے ایک بات میری سمجھ میں آئی۔ اِس سوال کا جواب تلاش کرتے کرتے میری توجہ اپنی آواز سے ہٹ کر دوسروں کی آوازوں کی طرف چلی گئی۔ شاید آدمی اپنی آواز کو سمجھنے کے لیے پہلے دوسروں کو سُننا سیکھتا ہے۔

آدمی کی اپنی آواز سے زیادہ دلچسپ شاید دوسروں کی آوازیں ہوتی ہیں۔ اپنی آواز سے ہم شکایت کر سکتے ہیں، مگر دوسروں کی آوازیں ہمارے پاس ایک عجیب اختیار کے ساتھ آتی ہیں۔ ہم اُنہیں سنتے ہیں اور فوراً فیصلہ کر لیتے ہیں کہ سامنے والا کیسا آدمی ہوگا۔

کسی کی آواز بھاری ہو تو ہمیں اُس میں دانائی محسوس ہونے لگتی ہے۔ کوئی دھیمی آواز میں بات کرے تو ہم اُسے شریف سمجھ لیتے ہیں۔ اور اگر کوئی ہر جملے کے آخر میں "جی" کہے تو ہم اُسے تہذیب کا آخری نمونہ سمجھنے لگتے ہیں، چاہے وہ گھر جا کر اپنے بچوں سے کس لہجے میں بات کرتا ہو، ہمیں کیا معلوم۔

میری فون پر کئی مرتبہ ایسے لوگوں سے بات ہوئی جنہیں میں نے پہلی آواز ہی میں بہت سنجیدہ اور سلجھا ہوا آدمی سمجھ لیا۔ بعد میں ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ صاحب بھی باقی انسانوں ہی کی طرح ہیں، اور چائے کے کپ کے ساتھ بسکٹ ڈبو کر کھانے کے معاملے میں بھی کوئی واضح پالیسی نہیں رکھتے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہم کسی شخص کی آواز سے اُس کا موڈ تک پہچان لیتے ہیں۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔"

صرف دو لفظ، مگر آواز بتا دیتی ہے کہ کچھ ضرور ہوا ہے۔ ماں تو آواز سے موڈ پہچاننے میں شاید دنیا کی سب سے ماہر مخلوق ہوتی ہے۔ بچہ صرف "جی" کہے تو وہ جان لیتی ہے کہ اِس "جی" کے پیچھے پوری کہانی موجود ہے۔

آواز کا ایک تعلق وقت سے بھی ہے۔ کچھ آوازیں ہمیں موجودہ زمانے سے اُٹھا کر سیدھا ماضی میں پہنچا دیتی ہیں۔ کوئی پرانا دوست اچانک فون کرے اور صرف "السلام علیکم" کہے تو نام پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ آواز میں وقت محفوظ رہتا ہے۔

پرانے زمانے میں لوگ خطوط محفوظ رکھتے تھے۔ اب ہمارے پاس تصویریں ہیں، ویڈیوز ہیں، مگر کسی عزیز کی ایک سادہ سی "ہاں، بتاؤ" والی آواز محفوظ نہیں ہوتی۔

یہ انسانی طبیعت بھی عجیب ہے۔ جو چیز ہمارے پاس ہوتی ہے، اُس کی قدر کم ہوتی ہے؛ جو چھن جائے، وہ قیمتی ہو جاتی ہے۔ روزانہ سنائی دینے والی آواز کبھی معمولی لگتی ہے، پھر وہی آواز ایک دن یاد بن جائے تو دل اُسے سننے کے لیے ترسنے لگتا ہے۔

شاید اِسی لیے اب کسی کی آواز سنتا ہوں تو صرف یہ نہیں سنتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، یہ بھی سنتا ہوں کہ اِس آواز کے پیچھے کون سا زمانہ بول رہا ہے۔ کبھی کسی کے لہجے میں گھر ہوتا ہے، کبھی لفظوں میں جدائی، کبھی ہنسی میں بچپن۔

اب زمانہ ایسا آگیا ہے کہ مشینیں ہماری آواز کی نقل بھی کرنے لگی ہیں۔ چند لمحوں کی آواز لے کر ایسی آواز تیار کی جا سکتی ہے جو بظاہر ہماری ہی معلوم ہو، حتیٰ کہ ایسی بات بھی کہہ سکتی ہے جو ہم نے کبھی کہی ہی نہ ہو۔

یہ سہولت بھی ہے اور عجیب سا خوف بھی۔

کل تک ہمیں اپنی آواز اِس لیے اجنبی لگتی تھی کہ ریکارڈنگ میں وہ ہمیں اپنی نہیں لگتی تھی۔ اب شاید ایک دن یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ جو آواز ہم سُن رہے ہیں، وہ واقعی ہماری ہے بھی یا نہیں۔ اور اگر مشین میری آواز مجھ سے زیادہ خوب صورت بنا دے تو کیا میں اُس سے حسد کروں گا؟

یہ سوال سننے میں مضحکہ خیز ہے، مگر انسان کی فطرت کچھ ایسی ہی ہے۔ ہم آئینے میں اپنی شکل بہتر دیکھنے کے لیے روشنی درست کرتے ہیں، تصویر میں چہرہ سنوارنے کے لیے زاویہ بدلتے ہیں، تو پھر اپنی آواز کو بہتر بنانے کی خواہش کیوں نہ کریں؟

لیکن شاید یہاں ایک خطرہ بھی ہے۔ آدمی اگر اپنی ہر چیز کو دوسروں کی پسند کے مطابق سنوارتا رہے تو ایک وقت آتا ہے جب اُسے اپنی اصل صورت ہی اجنبی لگنے لگتی ہے۔ شاید یہی معاملہ آواز کا بھی ہے۔

دوسروں کے سامنے ہم اپنی آواز بدل سکتے ہیں، لہجہ نرم کر سکتے ہیں، رعب لا سکتے ہیں۔ اور اکیلے میں؟

اکیلے میں آدمی کے پاس اپنی آواز سے بچنے کی کوئی جگہ نہیں۔ وہاں نہ مائیک ہے، نہ سامعین، نہ گفتگو کا بہانہ۔ وہاں صرف انسان ہے اور اُس کے اندر بولنے والی ایک آواز۔ شاید اِسی آواز سے ہم سب سے زیادہ گھبراتے ہیں، کیونکہ یہ آواز ہمیں وہ باتیں بتاتی ہے جو ہم دوسروں سے چھپا لیتے ہیں۔

دن بھر آدمی بہت سے لوگوں سے بات کرتا ہے۔ گھر میں، دفتر میں، بازار میں، سوشل میڈیا پر۔ لیکن دن ختم ہونے کے بعد جب شور کم ہوتا ہے تو ایک خاموش سوال اندر سے اُٹھتا ہے:

"تم خود کیا چاہتے ہو؟"

اِس سوال کا جواب ہمارے پاس اکثر نہیں ہوتا، کیونکہ ہم نے دوسروں کی آوازیں اتنی زیادہ سُن رکھی ہوتی ہیں کہ اپنی آواز مدھم پڑ جاتی ہے۔

شاید اِسی لیے خاموشی ضروری ہے۔ خاموشی میں کوئی دوسرا ہمیں نہیں بتاتا کہ ہمیں کیا سوچنا ہے۔ وہاں صرف ہماری اپنی آواز ہوتی ہے۔ وہ آواز جو شاید بہت عرصے سے ہم سے بات کرنا چاہ رہی ہوتی ہے۔

میں نے ایک دن پھر اپنی پرانی ریکارڈنگ چلائی۔ وہی آواز تھی جسے میں کبھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اِس بار نہ موبائل کو قصوروار ٹھہرایا، نہ مائیک کو، نہ اپنی سماعت کو۔

مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ یہ آواز شاید خوب صورت نہیں، مگر یہ میری ہے۔ اِس میں میری جلد بازی بھی ہے، میری جھجھک بھی، میری خوشی بھی، میری تھکن بھی۔ اِس میں اُن لوگوں کی آوازیں بھی کہیں نہ کہیں شامل ہیں جن سے میں نے بولنا سیکھا۔

تب مجھے لگا کہ شاید انسان کو اپنی آواز پسند کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ وہ اِسے پہچان لے۔ کیونکہ دنیا میں سب سے مشکل کام شاید یہ نہیں کہ آدمی اپنی آواز دوسروں تک پہنچائے۔ مشکل کام یہ ہے کہ وہ اپنی آواز تک خود پہنچے۔

اور شاید اِسی سفر کا نام زندگی ہے۔

میں نے موبائل بند کر دیا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ کچھ دیر تک مجھے کچھ سنائی نہیں دیا۔ پھر نہ جانے کیوں، مجھے لگا جیسے کوئی بہت دُور سے مجھے پکار رہا ہے۔

میں نے غور سے سنا۔

وہ کسی اور کی آواز نہیں تھی۔

وہ میں تھا۔

بشکریہ پی بی سی بنوں

افسانہ

ایک دسترخوان، تین قسم کے کھانے

تحریر :۔نور محمد ترکئی، سابق افغان صدر

وہ بے چارہ صبح سویرے اُٹھتا اور اُٹھ کر کھاد لے جانے کا کام شروع کرتا۔ وہ یہ کھاد اپنے کندھے پر لاد کر اپنی زمین پر لے جاتا، آٹھ افراد پر مشتمل اِس خاندان کا گزر بسر بہت مشکل سے ہو رہا تھا کیونکہ زمین بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ اِس سے فقط تین مہینوں تک گھر چلایا جاسکتا تھا۔ یہ فصل بھی انتہائی سخت مشقت کے بعد دے پاتا، باقی نو مہینے محنت مزدوری کرنا پڑتی تھی وہ بھی یوں کہ سال کے باقی نو مہینے وہ مزدوری کے ساتھ لکڑیاں لا کر بیچتا اور جو آمدن ہوتی اُس سے بمشکل زندگی کی تاریک شب سحر کرتا۔ بہت مشکل زندگی تھی اُس کی۔

اُس کے تین بیٹے تھے لیکن سب ہی آٹھ سال سے کم، اِس لیے وہ اُس کا ہاتھ ابھی نہیں بٹا سکتے تھے۔ اگرچہ بیٹیاں بھی تھیں لیکن روایات اور اقدار ایسی تھیں کہ اُس کی بیٹیاں چاہنے کے باوجود اُس کی کوئی مدد کرسکنے کے قابل ہی نہیں رہی تھیں۔ اِس لیے پورے گھر کی کفالت سمیت تمام ذمہ داریاں اُس کے سپُرد تھیں۔ چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا تھا جو کہ ہموار زمین کی نسبت قدرے فراز پر واقع تھا جہاں پانی بہم نِسبتاً پہنچانا مشکل تھا۔ اُس نے جو تخمینہ لگایا تھا، اُس کے مطابق اگر وہ اِس زمین پر بادام کے درخت لگاتے تو سالانہ اچھی خاصی آمدن متوقع تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اُن درختوں کو پانچ سال تک متواتر پانی دینا ضروری تھا جو اِس سے مشکل تھا اور پانچ سالہ انتظار کی سکت اپنے آپ میں نہ دیکھ پاتا۔ وہ چونکہ مستقبل بارے سنجیدہ تھا، اکثر و بیشتر سفید ریش بزرگوں سے مشورہ کرنے لگتا۔ سب نے اُس کی ہمت باندھی کہ پانچ سال ہی کا تو عرصہ ہے پھر آپ کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ بیوی اور بیٹیوں نے بھی بادام لگانے کی تائید کی اور اِس عزم کا اظہار کیا کہ فقط پانچ سال ہی کا عرصہ ہے اِس دوران اگر وہ مٹکوں اور برتنوں میں بھی چاہیں تو پانی اُوپر پہنچا کر درختوں کو دے سکتے ہیں سو اُس نے بھی تہیہ کرلیا کہ بادام کے درخت لگالئے جائیں۔

آمدِ بہار کے ساتھ وہ محنت مزدوری کے بعد واپس اپنے گائوں پہنچا، بادام کے نہال اُدھار کہیں سے لیے اور وعدہ کیا کہ وہ ان یک سالہ نہالوں کے بدلے اُن کے لیے گرمیوں میں لکڑیاں لائے گا اور یوں یہ رقم چکادے گا۔ سچ ہے کہ انسانی عزم و ہمت کا بدل نہیں، انسانی عزم و ہمت قوی ہو تو بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے جاسکتے ہیں۔ کچھ عرصہ میں زمین کا وہ ٹکڑا جو پانی سے دور اونچائی پر واقع تھا، ایک سبز زار باغ کا منظر پیش کرنے لگا۔ بادام کے نہال ابھی درخت بننے کو تھے۔ سب ہی حیران تھے۔ وہ اب اِنہی سوچوں میں گُم رہتا کہ کب درختوں پر بادام لگیں گے۔ وہ اپنے تابناک مستقبل کا سوچ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ اُس نے تمام گھر والوں کے لیے ہر سال نئے کپڑے خریدنے کا وعدہ کیا تھا۔ سو پورا خاندان خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

کچھ نہ کچھ سرمایہ رکھنے والے ہر شخص کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ باغ اُس سے خریدا جائے۔ بالخصوص خان صاحب تو اِسی تاک میں تھے کہ کسی طرح سے باغ اپنی ملکیت میں لے لے۔ گائوں کا مولوی صاحب بھی اب خاصا امیر ہو چکا ہے اور پوری جائیداد کا مالک ہے۔ وہ بھی چالیس پچاس درختوں پر مشتمل اِس باغ پر اپنی نظریں جمائے بیٹھا ہے۔ اِس لیے مولوی صاحب اور خان صاحب کے مابین ایک رقابت بھی اندر ہی اندر پنپ رہی ہے۔

دونوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے اُس بے چارے سے دوستی کی پینگیں بڑھانی شروع کیں لیکن وہ کسی بھی صورت نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے اہل و عیال کا واحد ذریعہ آمدن (جس نے ابھی ٹھیک طرح سے آمدن دینی بھی شروع نہیں کی تھی) بیچ دے۔

وہ اُن سے ہمیشہ کہتا چلا آیا تھا کہ آپ سب دیکھ رہے ہیں کہ صرف میں نہیں بلکہ گھر کے ہر فرد کا اِس میں پورا حصہ ہے اور اب بھی کتنی اُٹھا رہا ہے ہم سب ہی اپنے کندھوں پر کبھی کھاد اُٹھائے درختوں کو دیتے ہیں۔ کبھی پانی اِسی طریقے سے پہنچا رہے ہوتے ہیں۔ ابھی تک تو ہم باغ کا اولین ثمر بھی نہیں دیکھ پائے ہیں۔ اُن کو تو آنے دیں۔ سال بھر میں نئے کپڑے تو خریدنے دیں۔ خریدار رُکنے والے کہاں تھے۔ وہ متواتر اپنی بات دہراتے، آخر کار جب اُنہوں نے محسوس کیا کہ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں والا، تو وہ منصوبہ تشکیل دینے لگے۔

پہلے ایک شخص کو دستاویزات دے کر اُس کے خلاف اُٹھایا کہ وہ اُس کا قرض نہیں دے رہا جو اُنہوں نے مدتوں پہلے اُسے دیا ہے۔ اُنہوں نے حکومتی کارندے اُسے پکڑنے کے لیے بھیجے۔ اب ایسے گھر آئے حکومتی کارندوں کی خدمت کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ سو اُن حکومتی کارندوں کی خدمت کے لیے بے چارے خاندان کو کہیں سے اچھا گندمی آٹا سود پر لینا پڑا۔

شام کے لیے دودھ اور دیسی گھی سے تیار کھانے کا بندوبست کیا گیا (پشتون آج بھی یہ خوراک انتہائی شوق سے کھاتے ہیں۔ دیسی گھی اور خالص دودھ کو اُبال کر اِس میں روٹی ڈبو کر کھائی جاتی ہے)۔

رات کھانے کے دسترخوان پر اُس نے مہمان کی جانب گندمی روٹی، خان صاحب کے سامنے مکئی کی روٹی اور اپنے سامنے جوار کی روٹی رکھی۔ بد قسمتی سے کھانے کو مہمان کے ہاتھ جوار کی روٹی لگی جسے نگلتے ہی اُس نے خشمگیں نگاہوں سے اُسے گھورتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں بتایا کہ میری تضحیک کی سزا تجھے مل ہی جائے گی اور یہ ظاہر کر ہی دیا کہ ایک دسترخوان پر تین قسم کی روٹی رکھی گئی ہے۔

توقعات کے عین مطابق بہت جلد مایوس ہوتے ہوئے اُس کی ہمت جواب دینے لگی اور حالات اُس کے خلاف ہی جارہے تھے۔ سو طے پایا کہ وہ دوسرا آدمی بھی جسے اِن درختوں میں دلچسپی تھی۔ اُسے اپنے ساتھ ملا لیا گیا۔ یوں اُس نے سود پر لیے قرض کے بدلے اُس کے تمام درخت بمعہ زمین اپنی ملکیت میں لیے جس کو بعد میں دو حصے کر کے تقسیم کر دیا گیا اور وہ غریب بے چارہ اپنی دو چار رضائیاں اور چند ایک برتن لیے دوسری منزل کی جانب چل پڑا۔

اور جب کئی برسوں بعد واپس لوٹا تو ایک بیٹی اور بیٹے کے علاوہ خاندان کے تمام افراد لقمۂ اجل بن چکے تھے۔ گائوں میں گہما گہمی نہیں تھی کیونکہ سب ہی کو اُس کی طرح بے گھر کر دیا گیا تھا۔

اُس کا بیٹا کچھ فہمیدہ اور پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ اِس لیے وہ اِس فکر کا داعی تھا کہ وہ تمام لوگ جنہیں اُس کے باپ کی طرح بے گھر کر کے بھگا دیا جا چکا ہے، اُن سب کو واپس بلا کر یکجا کیا جائے۔ اُنہیں اُن کی زمینیں دلائی جاسکتی ہیں لیکن اُس کی اِس سوچ پر متذکرہ بالا اشخاص ہنس رہے ہیں۔

اِس افسانے کے مصنف نور محمد ترکئی "1917-1979" پشتو کے ممتاز افسانہ نگار ناول نگار اور افغانستان کے سابق صدر تھے۔ اُنہوں نے پشتون معاشرے کی سماجی ،ناہمواریوں، غُربت اور انسانی نفسیات کو حقیقت پسندانہ اسلوب میں قلم بند کیا۔ جدید پشتو افسانے کی ترقی میں اُن کی خدمات نمایاں تصور کی جاتی ہیں۔

بشکریہ پی بی سی کوئٹہ

رفاقتوں کے 33 سال---- ریڈیو پاکستان چترال

جاوید اقبال جاوید

یکم اگست 1993ء کو ہوا کے دوش پر جب "یہ ریڈیو پاکستان چترال ہے" کی آواز پہلی بار سماعتوں سے ٹکرائی تو چترال کے لوگوں کو یوں محسوس ہوا جیسے اُن کے اپنے گھر کا کوئی فرد اُن سے ہم کلام ہو گیا ہو۔ یہ آواز محض ایک ریڈیو اسٹیشن کے آغاز کا اعلان نہیں تھی بلکہ چترال کے لوگوں کے ساتھ ایک ایسی رفاقت کا آغاز تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ مزید مضبوط ہوتی چلی گئی۔

گزشتہ 33 برسوں کے اِس طویل سفر میں ریڈیو پاکستان چترال نے معلومات، تعلیم اور تفریح کی فراہمی کے ساتھ ساتھ مقامی ثقافت، زبانوں، روایات اور عوامی مسائل کو اُجاگر کرنے میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ بدلتے وقت اور جدید ذرائع ابلاغ کے باوجود اِس ادارے نے اپنی افادیت برقرار رکھی اور چترال کے دور افتادہ علاقوں میں بسنے والے لوگوں تک معتبر معلومات اور معیاری نشریات پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

پاکستان کے شمال مغرب میں واقع چترال اپنی منفرد تہذیب و تمدن، قدیم روایات اور متنوع ثقافتی ورثے کے باعث اہمیت کا حامل ہے۔ تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے چترال ایک منفرد خطہ ہے، جو صدیوں سے وسطی، جنوبی اور مشرقی ایشیا کی مختلف تہذیبوں کے سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس کے تہذیبی منظر نامے میں شیراز و اصفہان، سمرقند و بخارا، کاشغر و ختن اور کشمیر و کابل کی تہذیبی و ثقافتی روایات کے گہرے اثرات اور رنگارنگ جھلکیاں نمایاں نظر آتی ہیں۔ یہی تنوع چترال کو محض ایک جغرافیائی خطہ نہیں بلکہ مختلف تہذیبوں، زبانوں، روایات اور ثقافتوں کے حسین امتزاج کا آئینہ دار بناتا ہے۔ چترال کی کالاش وادی بیریر، بمبوریت اور رومبور میں آباد تقریباً تین ہزار نفوس پر مشتمل کالاش برادری اِس قدیم تہذیبی ورثے کی ایک منفرد اور زندہ مثال ہے۔

اہلِ چترال کی ریڈیو سے وابستگی کی تاریخ کئی دہائیوں پر محیط ہے اور اِس کے ابتدائی نقوش مہترِ چترال ہز ہائینس سر ناصر الملک کے دورِ حکومت تک جا پہنچتے ہیں، جب ریڈیو نے چترال کے پایۂ تخت سے لے کر دُور دراز دیہات تک لوگوں کی زندگی میں ایک نئی اور حیرت انگیز تبدیلی پیدا کی۔ اُس زمانے میں ٹرانزسٹر ریڈیو ایک نئی اور ناقابلِ یقین ایجاد کی حیثیت رکھتا تھا، جسے لوگ حیرت اور تجسس کے باعث جادوئی ڈبہ (Magic Box) کہا کرتے تھے۔

ریڈیو کے بارے میں عوامی خدشات اور بے یقینی کو دور کرنے اور اُنہیں اِس نئے ذریعۂ ابلاغ سے روشناس کرانے کے لیے مہترِ چترال نے 1937ء میں ایک گلوکار غلام نبی کو آل انڈیا ریڈیو پشاور بھیجا۔ غلام نبی نے وہاں سے ہلکی پھلکی گفتگو اور موسیقی پر مشتمل پروگرام پیش کیے، جس کے نتیجے میں چترال کے لوگوں کی ابتدائی بے یقینی رفتہ رفتہ اعتماد میں بدل گئی اور ریڈیو عوامی زندگی کا حصہ بنتا چلا گیا۔ ریڈیو سے یہ ابتدائی رفاقت آگے چل کر باقاعدہ نشریاتی تعلق میں تبدیل ہوئی۔ 7 نومبر 1965ء کو ریڈیو پاکستان پشاور سے کھوار زبان میں کھوار مجلس کے نام سے ہفتہ وار پروگرام کا آغاز ہوا، جس نے چترال کے لوگوں کو اپنی زبان، ثقافت، ادب، موسیقی اور مقامی مسائل کو ریڈیو کے ذریعے اُجاگر کرنے کا ایک مؤثر پلیٹ فارم فراہم کیا۔

چترال میں باقاعدہ ریڈیو اسٹیشن کے قیام کی خواہش اُس وقت مزید مضبوط ہوئی جب شہید ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دورۂ چترال کے دوران مقامی لوگوں کی دیرینہ خواہش پر یہاں ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کا اعلان کیا۔ بعدازاں 1988ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں شہید محترمہ بے نظیر بھٹو وزیرِاعظم بنیں تو اُنہوں نے اپنے والد کے اِس وعدے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فوری اقدامات کیے۔ چنانچہ ہنگامی بنیادوں پر کرائے کی عمارت سے ریڈیو کی نشریات کا آغاز کیا گیا، جبکہ مستقل ریڈیو اسٹیشن کی عمارت کی تعمیر کا کام بھی شروع کر دیا گیا۔ بالآخر یکم اگست 1993ء کو ریڈیو پاکستان چترال نے اپنی باقاعدہ نشریات کا آغاز کیا۔ یہ محض ایک ریڈیو اسٹیشن کا قیام نہیں تھا بلکہ چترال کی زبان، ادب، ثقافت،

موسیقی، روایات اور عوامی آواز کو قومی نشریاتی دھارے کا مستقل حصہ بنانے کی جانب ایک تاریخی قدم تھا۔ یوں غلام نبی کی ابتدائی آواز سے شروع ہونے والی یہ رفاقت، کھوار مجلس کے سفر سے گزرتی ہوئی ریڈیو پاکستان چترال کی باقاعدہ نشریات تک پہنچی اور آج بھی اہلِ چترال اور ریڈیو کے درمیان ایک مضبوط، جذباتی اور تاریخی رشتے کی صورت میں قائم ہے یکم اگست 1993ء کو ریڈیو پاکستان چترال نے 250 واٹ کے AM کے ساتھ اپنی نشریات کا باقاعدہ آغاز کیا۔ بعدازاں 2006ء میں یہاں 2 کلوواٹ کا FM نصب کیا گیا، تاہم چترال کے دشوار گزار پہاڑی اور وادیوں کی طبعی ساخت کے باعث ریڈیو پاکستان چترال کی نشریات آج بھی ضلع کے ایک محدود حصے تک ہی مؤثر طور پر پہنچ پاتی ہیں۔ اندازے کے مطابق مجموعی آبادی کے صرف 20 سے 25 فیصد افراد کو نشریات دستیاب ہیں، جبکہ سو سے زائد دیہات میں سے بہت کم آبادیوں تک ریڈیو پاکستان چترال کی آواز پہنچتی ہے۔ اِس صورتحال کے باعث ایک بڑے حصے کے عوام اِس قومی نشریاتی ادارے کی تعلیمی، معلوماتی اور تفریحی خدمات سے محروم ہیں۔ چترال کی لسانی شناخت بھی غیر معمولی تنوع کی حامل ہے۔ کھوار یہاں کی اکثریتی اور رابطے کی زبان ہے، جو تقریباً 92 فیصد آبادی کی مادری زبان بھی ہے۔ کھوار کے علاوہ خطے میں 11 اور زبانیں بھی بولی جاتی ہیں، جن میں کالاشہ، گوار بتی اور یدغہ کو معدومیت کے خطرے سے دوچار زبانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اِن زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد دس ہزار سے بھی کم ہے۔ ایسے لسانی تنوع کے حامل خطے میں ریڈیو مقامی زبانوں کے تحفظ، فروغ اور نئی نسل تک اُن کی منتقلی کے لیے ایک نہایت مؤثر ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ریڈیو پاکستان چترال نے 1993ء سے اب تک اپنے سامعین کی ضروریات، ترجیحات، مقامی تقاضوں اور سماجی و ثقافتی مزاج کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مختلف موضوعات پر متنوع اور معیاری پروگرام پیش کیے ہیں۔ اسلامی، ثقافتی، ادبی، زرعی، صحت، معلوماتی اور خصوصی سامعین کے لیے تیار کیے جانے والے پروگرام عوام میں خصوصی مقبولیت رکھتے ہیں۔ اِن پروگراموں کے ذریعے نہ صرف مقامی مسائل اور عوامی آواز کو اُجاگر کیا جاتا ہے بلکہ تعلیم، صحت، زراعت، سماجی آگاہی، ثقافت، ادب اور تفریح کے حوالے سے بھی مفید معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ ریڈیو پاکستان چترال سے وابستہ رہنے والے تمام اسٹیشن ڈائریکٹرز، پروڈیوسرز، براڈکاسٹرز اور دیگر ملازمین نے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں، تخلیقی کاوشوں اور مسلسل محنت کے ذریعے اِس ادارے کو ایک منفرد اور عوام دوست ریڈیو اسٹیشن کے طور پر متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُن کی مشترکہ کوششوں کے نتیجے میں ریڈیو پاکستان چترال نے نہ صرف معیاری پروگرامنگ کی روایت قائم رکھی بلکہ چترال کی تہذیب، ثقافت، زبان، ادب، موسیقی اور روایتی اقدار کو قومی سطح پر اُجاگر کرنے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔

تاہم چترال کے عوام کی دیرینہ خواہش آج بھی یہی ہے کہ ریڈیو پاکستان چترال کی نشریات ضلع کے تمام علاقوں، خصوصاً دور دراز اور دشوار گزار وادیوں تک پہنچیں، تاکہ یہاں کے لوگ اپنی مادری اور مقامی زبانوں میں تعلیم، معلومات، آگاہی اور معیاری تفریح کے مؤثر ذرائع سے مستفید ہو سکیں۔ اِس مقصد کے لیے موجودہ ٹرانسمیشن نظام کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا، ٹرانسمیٹر استعداد میں اضافہ اور نشریاتی کوریج کو پورے چترال تک وسعت دینا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

"ریڈیو پاکستان بہاولپور کی سالگرہ '(18 اگست 1975 تا 18 اگست 2026) ہماری آواز کے 51 برس

تحریر ۔ فیض رسول ہاشمی

صحرائے چولستان کے ساتھ واقع عظیم تہذیبی اور تاریخی ثقافت کی سرزمین بہاولپور اور بہاولپور کی آواز "ریڈیو پاکستان بہاولپور "18 اگست 2026ء کو اپنے قیام کے 51 سال مکمل کر رہا ہے۔ 18 اگست 1975ء کو ریڈیو پاکستان کے آٹھویں ریڈیو اسٹیشن بہاولپور نے اپنے نشریاتی سفر کا آغاز کیا۔ ریڈیو پاکستان بہاول پور، ایک ایسا نشریاتی ادارہ ہے جسے اپنے نشریاتی سفر میں کئی قومی اور بین الاقوامی اعزازات حاصل ہیں۔ ایشین براڈکاسٹنگ یونین کے ایوارڈز، عالمی مقابلوں میں پاکستان کی نمائندگی کے اعزاز، قومی اور صوبائی پی بی سی ایکسی لینس ایوارڈز میں شاندار کارکردگی اِسے پاکستان کے ایک منفرد ریڈیو اسٹیشن کی حیثیت عطا کرتی ہے۔ ریڈیو پاکستان بہاولپور کی گولڈن جوبلی تقریبات محض ایک روزہ جشن نہیں رہا بلکہ طویل عرصے تک جاری رہنے والا ایک یادگار سلسلہ تھا جن میں ادارے کی نصف صدی پر محیط خدمات اور اِس سے وابستہ افراد کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ اِس دوران وائس چانسلر گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونیورسٹی بہاول پور پروفیسر ڈاکٹر شازیہ انجم نے خواتین کمپیئرز، آر جیز اور نیوز ریڈرز سے مکالمہ کیا اور سرٹیفکیٹ تقسیم کیے، جبکہ سابق میئر بہاول پور عقیل نجم ہاشمی اور سابق کنٹرولر نیوز ریڈیو پاکستان جاوید اختر نے مرد کمپیئرز اور صداکاروں کی حوصلہ افزائی کی اور تعریفی اسناد تقسیم کیں۔ سابق ایڈیشنل کمشنر کوآرڈینیشن اور موجودہ MD پی ایچ اے بہاولپور ڈاکٹر نیئر مصطفیٰ اور معروف سرجن، ادیب و شاعر ڈاکٹر جاوید اقبال نے انجینئرز و انتظامی عملے سے مکالمہ کرتے ہوئے اُنہیں اعزازی شیلڈز پیش کیں، جبکہ ہاکی کے نامور کھلاڑی اور سابق کپتان قومی ہاکی ٹیم اولمپیئن سمیع اللہ خان "فلائنگ ہارس" کی شرکت نے گولڈن جوبلی کو مزید یادگار بنا دیا جنھوں نے پروڈیوسرز اور مختلف شعبوں کے سربراہان میں اعزازی شیلڈز اور اسناد تقسیم کی گئیں۔ ریڈیو پاکستان بہاولپور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے روایتی نشریات کے ساتھ تیزی سے ڈیجیٹل میڈیا پروڈکشن کی جانب بڑھ رہا ہے۔ فیس بک پر تقریباً 70 ہزار فالوورز، یوٹیوب پر 15 ہزار سبسکرائبرز جبکہ ٹک ٹاک، انسٹا گرام اور ایکس پر بھی ادارے کی مؤثر موجودگی ہے۔ ریڈیو پاکستان بہاولپور مصنوعی ذہانت (AI) کو بھی ڈیجیٹل پروڈکشن کا حصہ بنا کر مختلف معلوماتی، آگاہی اور تخلیقی ویڈیوز تیار کر رہا ہے۔

اِسی تناظر میں 13 فروری 2026ء، عالمی یومِ ریڈیو کے موقع پر ریڈیو پاکستان بہاولپور میں "ریڈیو اور مصنوعی ذہانت" کے عنوان سے سیمینار بھی منعقد کیا گیا جو ریڈیو اور جدید ٹیکنالوجی کے باہمی تعلق کی نئی جہتوں کی عکاسی کرتا ہے۔

ریڈیو پاکستان کے ایف ایم 101 بہاولپور کی دسویں سالگرہ 16 جنوری 2026ء کے موقع پر پُروقار تقریب اور لائیو نشریاتی شو کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب کی مہمانِ خصوصی محترمہ سعدیہ بلال نے اِس موقع پر ایف ایم 101 بہاولپور کی آر جیز فوٹو گیلری کا افتتاح کیا، دیگر مہمانوں اور آر جیز کے ہمراہ سالگرہ کا کیک کاٹا اور آر جیز میں تعریفی اسناد تقسیم کیں۔ وفاقی وزیر برائے اطلاعات و نشریات جناب عطا اللہ تارڑ کی خصوصی ہدایت پر ریڈیو پاکستان بہاولپور کی خستہ حال چار دیواری کی تعمیرِ نو کا منصوبہ شروع کیا گیا۔ اِس منصوبے کا سنگِ بنیاد مرحوم رُکن قومی اسمبلی و سابق صوبائی وزیر ملک محمد اقبال چنڑ نے رکھا، جبکہ اِس اہم منصوبے کی عملی تعبیر ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان جناب سعید احمد شیخ کی انتھک کاوشوں، عزم اور مسلسل سرپرستی کا ثمر تھی۔ چار دیواری کی تعمیر کا باقاعدہ آغاز 24 مارچ 2026ء کو ہوا اور تین ماہ کی مختصر مدت میں منصوبہ کامیابی سے مکمل کر لیا گیا۔

جشنِ آزادی پاکستان 2026ء کے موقع پر ریڈیو پاکستان بہاولپور نے قومی تاریخ، تحریکِ پاکستان، حبُ الوطنی، قومی یک جہتی اور نئی نسل میں نظریۂ پاکستان سے وابستگی کے فروغ کے لیے خصوصی نشریاتی، ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں کا جامع سلسلہ پیش کیا۔ اِس موقع پر میڈیم ویوز کے لائیو اسٹوڈیو کو بانئ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ سے منسوب کر کے "جناح اسٹوڈیو" جبکہ ایف ایم 101 کے لائیو اسٹوڈیو کو مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کے نام سے موسوم کر کے "اقبال سٹوڈیو" کا نام دیا گیا۔ ریڈیو پاکستان بہاولپور خطے کے طلبہ و طالبات کے لیے عملی تربیت کا اہم مرکز بھی ہے۔ نئی نسل کو ابلاغی دنیا سے روشناس کرانے کے لیے نجی تعلیمی اداروں کے طلبہ و طالبات وقتاً فوقتاً مطالعاتی دورے کرتے ہیں جن کے دوران اُنہیں میڈیم ویو، ایف ایم 101، پوڈکاسٹ اسٹوڈیو، ماسٹر کنٹرول روم، فوٹو گیلری اور دیگر شعبہ جات کا دورہ کرایا جاتا ہے۔ ریڈیو پاکستان بہاولپور کے قیام کے 51 برس مکمل ہونے پر اسٹوڈیوز میں خصوصی سالگرہ شو "یہ جہاں آواز کا" منعقد کیا گیا جس میں ادارے سے وابستہ پروڈیوسرز، کمپیئرز، صداکاروں اور آر جیز نے شرکت کی۔ سالگرہ شو میں ریڈیو پاکستان بہاولپور کے 51 سالہ نشریاتی سفر کو اُجاگر کیا گیا۔ ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان سعید احمد شیخ نے اپنے پیغام میں ریڈیو پاکستان بہاول پور کو 51 ویں سالگرہ پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ ادارہ گزشتہ پانچ دہائیوں سے صرف اِس خطے کے عوام کی آواز بنا ہوا ہے بلکہ علم و آگاہی، ادب و ثقافت، فنون، کھیل اور قومی و معاشرتی شعور کے فروغ میں بھی نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ ریڈیو پاکستان بہاولپور کی مضبوط روایت اور سامعین سے دیرینہ رشتہ اِس کے اثاثے ہیں۔

پی بی سی بہاولپور، اسٹیشن ڈائریکٹر سجاد احمد بری کی قیادت میں اپنا نشریاتی سفر پورے جوش و خروش اور قومی جذبے کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہے۔

ترقی کا یہ سفر جاری ہے اور انشااللہ جاری رہے گا۔

ریڈیو پاکستان حیدرآباد

ثقافت و شعور کا سفرِ مسلسل

تحریر: نعیمہ صدیق

ریڈیو پاکستان حیدرآباد سندھ کی تہذیب، ثقافت، زبان اور مقامی روایات کے فروغ میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے اور یہ درخشندہ سفر سالِ رواں 2026ء میں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہا۔ اِس عرصے میں ادارے نے اپنی دیرینہ نشریاتی روایت کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور ماضی کی مہک کو جدت کے رنگوں میں یوں سمویا کہ سامعین کے لیے ایک منفرد اور بھرپور تجربہ وجود میں آیا۔

سالِ رواں کی نمایاں کامیابیوں میں جدید پوڈکاسٹ اسٹوڈیو کا قیام سرِفہرست ہے جس نے سامعین کو معیاری اور متنوع مواد سے روشناس کرایا۔ اِسی پلیٹ فارم کے توسط سے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ نامور اور معتبر شخصیات کے یادگار انٹرویوز ریکارڈ کیے گئے۔ ادیب، شاعر، فنکار، ماہرینِ تعلیم، سماجی کارکن، دانشور اور ثقافتی نمائندے اِس سلسلے کا حصہ بنے اور اپنے تجربات و مشاہدات سے سامعین کے علم میں گراں قدر اضافہ کیا۔ عوامی خدمت کے قومی فریضے کو ادارے نے ذمہ داری، خلوص اور مہارت سے نبھایا۔ نشریات کے ذریعے معلومات، تعلیم اور تفریح کی فراہمی کے علاوہ نئی نسل کی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ اِسی مقصد کے تحت یونیورسٹی آف سندھ جامشورو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی اور مہران یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی سمیت مختلف تعلیمی اداروں کے طلبہ کو انٹرن شپ کی سہولت دی گئی جہاں اُنہیں نشریات، پروڈکشن، خبر رسانی اور پروگرام سازی کے عملی گُر سکھائے گئے۔

قومی یکجہتی اور مثبت شعور کے فروغ میں بھی ادارے نے قابلِ ذکر خدمات سرانجام دیں۔ امن، رواداری، مذہبی ہم آہنگی اور دہشت گردی کے خلاف قومی بیانیے کو تقویت دینے کے لیے خصوصی مذاکرے اور فیچر ترتیب دیے گئے جبکہ پاک افواج کی قربانیوں اور کارناموں کو بھی بھرپور انداز میں اُجاگر کیا گیا۔ اِسی ضمن میں "معرکۂ حق" کے موضوع پر تیار کردہ خصوصی نشریات اور سندھی ملی نغموں نے سامعین سے بے پناہ داد وصول کی جس نے نوجوان نسل میں حبُ الوطنی کے جذبے کو مہمیز دی۔

صبحِ پاکستان، سکھی گھر اور ہم نوجوان جیسے قومی رابطے کے پروگراموں میں فعال شرکت کے ذریعے تعلیم، صحت، خواتین اور ثقافت جیسے موضوعات کو نمایاں کیا گیا۔ مقامی پیشکش کے معیار کو بلند تر بنانے کی خاطر تحقیق، منصوبہ بندی اور اسکرپٹ نویسی پر خاص توجہ مرکوز رکھی گئی جس سے سامعین کا اعتماد پہلے سے کہیں مستحکم ہوا۔

عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے ادارے نے ڈیجیٹل موجودگی کو بھی مؤثر بنایا: ویب اسٹریمنگ کے ذریعے نشریات دنیا بھر تک پہنچیں جبکہ فیس بُک صفحے پر فالوورز اور رسائی میں گزشتہ برس کے مقابلے نمایاں اضافہ دیکھنے میں آیا جو ادارے پر عوامی اعتماد کی روشن دلیل ہے۔ یوں ریڈیو پاکستان حیدرآباد نے روایت اور جدت کے دلکش امتزاج سے عوامی خدمت، قومی شعور اور ثقافتی ورثے کے فروغ کا یہ سفر کامیابی سے جاری رکھا۔

ایف ایم 101 حیدرآباد کی 24 بہاریں

رپورٹ: نعیمہ صدیق

ایف ایم 101 حیدرآباد کی 24 ویں سالگرہ 14 جولائی 2026ء کو ایف ایم 101 حیدرآباد کے اسٹوڈیو میں لائیو پروگرام کے دوران ایک کیک کٹنگ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب میں ایم ایف 101 حیدرآباد کے انچارج محمد حسین نے کہا کہ ایف ایم 101 حیدرآباد عوام کو تفریح کے ساتھ ساتھ آگاہی جس میں تعلیم، ٹیکنالوجی، صحت، زراعت، سماجی و اقتصادی معلومات فراہم کرتے ہوئے اپنا بھرپور کردار ادا کر رہا ہے۔ گزشتہ 24 برسوں کے دوران ریڈیو نے عوام کو معیاری معلومات، تفریح اور ثقافتی ورثے کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اُنہوں نے ریڈیو کی ترقی میں خدمات انجام دینے والے تمام موجودہ اور سابق ملازمین کی کاوشوں کو سراہا۔

تقریب میں ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے اسٹیشن ڈائریکٹر علی اکبر جونے آئے ہوئے مہمانوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ایف ایم 101 حیدرآباد اپنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے عوام کو بہترین تفریح مہیا کر رہا ہے اور خاص طور پر نوجوانوں کی کیریئر کاؤنسلنگ کے حوالے سے تمام بہترین پروگرام یہاں سے نشر کئے جا رہے ہیں جس میں نوجوانوں کی بھرپور شرکت پروگراموں کو بہتر بنانے میں مزید اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

اِس موقع پر ایف ایم 101 اور ریڈیو پاکستان حیدرآباد کا تمام عملہ جن میں پروڈیوسرز، اکاؤنٹ سیکشن، ایڈمن سیکشن اور اناؤنسر کمپیئرز کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ تقریب کے آخر میں ایف ایم 101 انچارج محمد حسین اور اسٹیشن ڈائریکٹر علی اکبر ہن گورجو نے اسٹاف کے ہمراہ کیک کاٹا۔ تقریب خوشگوار ماحول میں اختتام پذیر ہوئی، جہاں شرکاء میں کیک تقسیم کیا گیا اور یادگاری تصاویر بھی بنائی گئیں۔

پنیالہ ۔ ایک سیاحتی مقام

تحریر: ڈاکٹر الطاف احمد شاہ

پنیالہ ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے شمال مشرق میں 60 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ایک خوبصورت قصبہ ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے پنیالہ جانے کے لئے پشاور روڈ پر گلوٹی اڈے کا راستہ استعمال کرنے کے علاوہ پہاڑپور سے بھی جایا جا سکتا ہے۔ جبکہ پنجاب سے آتے ہوئے چشمہ سے آگے کوہ رتہ کے ساتھ بھی رحمانی خیل سے ہوتے ہوئے پنیالہ پہنچا جا سکتا ہے۔ سی پیک روٹ کی تکمیل کے بعد اسلام آباد سے آنے والوں کے لئے رسائی بھی آسان ہو گئی ہے جو عبدالخیل انٹرچینج سے اُتر کر پنیالہ پہنچ سکتے ہیں۔ پنیالہ نہایت سرسبز، کھجور اور آموں کے باغات سے ڈھکا ہوا بے آب و گیاہ علاقے میں صدیوں سے آباد نخلستان ہے جہاں پانی کی فراوانی کے باعث پورے قصبے نے سبزے کی چادر اوڑھ رکھی ہے۔

یہاں کی خوبصورتی سیاحوں کو اپنی طرف ضرور متوجہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدرتی حُسن کے دلدادہ ایک انگریز مصنف Elphinstone لکھتے ہیں کہ " ہمارا کیمپ گاؤں پنیالہ (Puneealla) کے خوشگوار اور خوبصورت جگہ کے قریب لگا ہوا تھا۔ ایسے جیسے کوئی عرب علاقے میں خوبصورت نظارے سے محظوظ ہو رہا ہو۔ یہ ایک ریتلی وادی تھی جو ڈھلوانی پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی جس کو ندی سے پانی ملتا تھا"۔ Elphinstone مزید لکھتے ہیں کہ " ہر طرف کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ پھیلے ہوئے ہیں۔ خود گاؤں بھی کھجور کے درختوں کے درمیان، پہاڑوں کے دامن میں کھڑا نظر آتا ہے۔ اِن پہاڑوں سے کئی چشمے شدت سے پھُوٹ کر درختوں میں کاریز بنائے ہوئے تھے"۔

کوہ شیخ بدین اور کوہ رتہ کے دامن میں واقع اِس خوبصورت وادی میں آبپاشی کا نظام کاریزوں کے ذریعے ممکن بنایا جاتا ہے۔ ہر کاریز کے آخری سرے پر ایک بڑے تالاب میں پانی ذخیرہ کیا جاتا ہے جو گرمیوں میں قدرتی Swiming Pool کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

پنیالہ میں بلُچ قبیلہ آباد ہے جن کی جد سے متعلق کئی ایک روایات موجود ہیں۔ میجر راورٹی کے مطابق "بلچ قبیلہ پڑانگی (Parangi) لودھی دراصل سید ہیں۔ علاقے کے اور افغان لوگ اُن کی بہت قدر کرتے ہیں اور اُن کو قدر و منزلت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔" میجر راورٹی مزید لکھتے ہیں کہ " یہ بادشاہ کی طرف سے دسواں حصہ ٹیکس اور جبری مشقت سے مستثنیٰ ہیں۔ اِس کے علاوہ شاہی فوج کو لڑائی کے لئے کوئی دستہ دینے سے بھی یہ لوگ مستثنیٰ قرار دیے گئے ہیں"۔

یہاں کے لوگوں کی زبان پشتو، جن کا اپنا ایک منفرد لہجہ جبکہ زبان رواں، صاف، شائستہ اور مہذب ہے جس میں ذخیرہ الفاظ کی بہتات کے باعث فصاحت و بلاغت اِن کا خاصا ہے۔ پنیالہ کی قدامت کا اندازہ یہاں پائے جانے والے آثار قدیمہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ جس میں (زڑا پالیا نڑہ) پرانہ پنیالہ قابلِ ذکر ہے جہاں پر کسی زمانے میں پہاڑ کے بالکل دامن میں قدیم آبادی کے کچھ آثار ملتے ہیں لیکن کسی حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے اِس پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ اسی طرح پنیالہ کے جنوب میں قصبے سے متصل 'کوٹ غر' پہاڑی پر کوٹ کے آثار ہیں جس کے بارے میں چرن جیت سنگھ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ " یہ رانی کا کوٹ ہے "۔ آج بھی اِس پہاڑی پر اِس کوٹ کے آثار نمایاں ہیں۔ سینہ بہ سینہ چلنے والی روایات کے مطابق یہاں ایک رانی کی حکومت رہی ہے لیکن ابھی تک محکمۂ آثارِ قدیمہ کی طرف سے یہاں کوئی باقاعدہ تحقیق نہیں ہوئی۔ پنیالہ کو اپنے مخصوص جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے علاقے میں ایک جنکشن کی حیثیت حاصل ہے جس کی وجہ سے سیاح اِسے دیکھے بغیر آگے نہیں جا سکتے۔ میجر آر۔ ٹی۔ آئی Ridgway لکھتے ہیں کہ " یہ بلچ پٹھانوں کا ہیڈ کوارٹر ہے جو ابتدائی حملہ آوروں کے ساتھ آ کر یہاں آباد ہوئے"۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ "بہلول لودھی کے زمانے میں سرہند پر کئی ایک پڑانگی قبیلے کے لوگ حکمران رہے"۔ یہ وہی بہلول لودھی ہے جس سے متعلق خوشحال خان خٹک کہتے ہیں۔

دبہلول اودا شیر شاہ خبرے اروم
چہ پہ ہند کبن پشتانہ وو بادشاہان

سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں بلچ قبیلے کے روحانی پیشوا حضرت حاجی بلچ بابا کی سینہ بہ سینہ روایات بھی مہمیز کا کام دیتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق پنیالہ میں پانی کی فراوانی اور چند قدموں پر پانی کی نایابی آپ کی کرامت کا نتیجہ ہے۔ ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں واقع یہ سیاحتی مرکز سیاسی لحاظ سے کافی نمایاں رہا ہے۔ تقسیمِ ہند سے پہلے مہاتما گاندھی جب پنیالہ آئے تو پنیالہ کے کنارے بہنے والے قدرتی پانی کی ندی جسے عرفِ عام میں طوئے کہتے ہیں، وہاں لوگوں کے روایتی رقص کرتے ہوئے زمین میں پانی کے بہتات کے باعث پانی نکل آیا جس کی خبر اُس وقت کے اخباروں میں نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ دراصل طوئے کی سرزمین سال کے بارہ مہینے گیلی رہتی ہے۔ یہاں عصر کے بعد تقریباً تمام نوجوان ٹولیوں کی شکل میں آ کر خوش گپیوں میں شام تک مصروف رہتے ہیں۔ کوئی کبڈی کھیل رہا ہے تو کوئی روایتی اخسئی، کوئی والی بال تو کوئی فٹ بال۔ کوئی کرکٹ تو کوئی اچک بال میں مصروف ہے۔ غرض طوئے ایک سٹیڈیم یا سپورٹس کمپی کس کا نظارہ پیش کر رہا ہوتا ہے۔ پنیالہ کا لنگڑا آم پورے پاکستان میں مشہور ہے جس کی خوشبو دُور سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ اِس کے علاوہ یہاں لاتعداد اقسام کے آم بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہاں کی کھجور پورے صوبے میں مشہور ہے۔ گرمیوں میں یہاں کے باسی مخصوص روایتی ٹوکریوں میں صبح صبح ہاتھوں میں یہاں کی سوغات لئے ڈیرہ شہر اور صوبے کے دوسرے شہروں کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں۔ یہاں کا موسم سردیوں میں سخت سرد جبکہ گرمیوں میں سخت گرم رہتا ہے۔ ریگستان ہونے کے باعث گرمیوں میں رات نسبتاً ٹھنڈی ہوتی ہے۔ پنیالہ میں پچھلے ادوار میں ایک ریسٹ ہاؤس بھی موجود تھا لیکن زمانے کی شکست و ریخت نے اُسے کھنڈر بنا دیا ہے۔ جبکہ رات کے قیام کیلئے ہوٹل بھی موجود نہیں ہیں۔ مہمانوں کو اور سیاحوں کو لوگ اپنے حجروں میں ٹھہراتے ہیں۔ معتدل موسم میں یہاں کے قدرتی میدان "طوئے" میں روایتی اینڈا بھی کھیلا جاتا ہے۔ جس کیلئے علاقے بھر سے لوگ جوق در جوق چلے آتے ہیں۔ اِس کے علاوہ رات کو " مجلس" موسیقی کا پروگرام بھی ارد گرد کے لوگوں کو یہاں آنے کے لئے متوجہ کرتا ہے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ پنیالہ جیسے سیاحتی مقام میں بنیادی ڈھانچے کو ترقی دی جائے تاکہ یہ خوبصورت علاقہ مزید سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ اور اگر پرانے مجوزہ منصوبے پر عمل کرتے ہوئے شیخ بدین اور پنیالہ کے درمیان چیئر لفٹ تعمیر کی دی جائے تو یہ علاقہ ملک بھر کے سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔

جنگلی حیات کے لئے سازگار ماحول اور قدرتی جنگلات اور پہاڑی علاقے کے باعث یہاں ہر قسم کے چرند، پرند اور جنگلی جانور پائے جاتے ہیں۔ جنگلی خونخوار جانور کبھی کبھی آبادی کے قریب بھی آ جاتے ہیں جس کا مقامی لوگ شکار بھی کرتے ہیں۔ اِن جانوروں میں ریچھ قابلِ ذکر ہیں۔

بشکریہ پی بی سی ڈیرہ اسماعیل خان

قلعہ منگلا --- تاریخ، تہذیب اور ورثے کی ایک لازوال داستان

علی اختر سلیم

صوبہ پنجاب اور خاص طور پر جب آپ ضلع جہلم کے شہر دینہ کی طرف سے آزاد کشمیر کا رخ کریں تو منگلا پُل عبور کرتے ہی آپ کو عین آپ کے سر کے اوپر پہاڑ کی چوٹی پر واقع ایک سیدھی کھڑی دیوار ملے گی۔ یہ دیوار جس کی خوبصورتی آپ کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، یہ قلعہ آزاد جموں وکشمیر کے ضلع میرپور میں دریائے جہلم کے کنارے واقع برصغیر کی قدیم ترین تاریخی یادگاروں میں سے ایک ہے۔ یہ قلعہ اِس خطے کی تہذیب، ثقافت، جنگی حکمتِ عملی اور مختلف ادوارِ حکومت کی ایک خاموش اور واضح گواہی بھی ہے۔ صدیوں پر محیط تاریخ اپنے دامن میں سمیٹے یہ قلعہ آج بھی آنے والوں کو ماضی کی عظمت اور شان وشوکت کا احساس دلاتا ہے۔

لفظ "منگلا" کے بارے میں مختلف روایات ملتی ہیں۔ بعض مؤرخین کے مطابق یہ نام قدیم ہندو دیوی "منگلا دیوی" سے منسوب ہے جبکہ کچھ کے نزدیک یہ نام اِس علاقے کی قدیم آبادی سے وابستہ ہے۔ اگرچہ اِس حوالے سے حتمی تاریخی اتفاق موجود نہیں، تاہم یہ بات طے ہے کہ منگلا صدیوں سے ایک اہم تجارتی اور عسکری مرکز رہا ہے۔ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ قلعے کی بنیاد تقریباً ایک ہزار برس قبل رکھی گئی۔ اگرچہ اِس مقام پر اِس سے بھی قدیم آبادیوں کے آثار ملتے ہیں، لیکن قلعے کی موجودہ ساخت زیادہ تر دسویں اور گیارہویں صدی کے بعد کے ادوار سے تعلق رکھتی ہے۔ اِس کی تعمیر کا بنیادی مقصد دریائے جہلم کے اہم راستے اور گرد و نواح کے علاقوں کی نگرانی اور دفاع تھا۔ قلعہ منگلا مختلف حکمرانوں کے زیرِ انتظام رہا۔ ہندو شاہی حکمرانوں کے بعد یہ خطہ مسلمانوں کی فتوحات کا حصہ بنا۔ بعد ازاں مغل دور میں اِس کی عسکری اہمیت برقرار رہی۔ مغل حکمرانوں نے شمالی علاقوں سے رابطے اور دفاعی ضروریات کے لیے اِس قلعے سے فائدہ اُٹھایا۔ سکھ دور میں بھی قلعہ ایک فوجی چوکی کے طور پر استعمال ہوتا رہا، جبکہ ڈوگرہ حکمرانوں نے بھی اِس کی اہمیت کو برقرار رکھا اور وقتاً فوقتاً اِس میں مرمت اور دیکھ بھال کا کام جاری رکھا۔

قلعے کی تعمیر اپنے زمانے کے اعلیٰ عسکری فنِ تعمیر کی عکاس ہے۔ مضبوط پتھروں سے بنی بلند فصیلیں، نگرانی کے لیے برج، داخلی دروازے، دفاعی راستے اور اندرونی صحن اِس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اِسے دشمن کے حملوں کا مؤثر انداز میں مقابلہ کرنے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔

قلعے کی بلند مقام پر تعمیر نے اِرد گرد کے وسیع علاقے پر نظر رکھنا آسان بنا دیا تھا۔ 1960ء کی دہائی میں جب پاکستان اور عالمی اداروں کے تعاون سے منگلا ڈیم کی تعمیر کا منصوبہ شروع ہوا تو اِس علاقے کی جغرافیائی اور سماجی صورتِ حال میں بڑی تبدیلی آئی۔ قدیم شہر میرپور سمیت متعدد بستیاں زیرِ آب آ گئیں، تاہم قلعہ منگلا کو اِس کی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر محفوظ رکھنے کے لیے خصوصی اقدامات کیے گئے۔ آج یہ قلعہ منگلا ڈیم جھیل کے کنارے اپنی تاریخی عظمت کے ساتھ موجود ہے اور قدیم و جدید دور کے حسین امتزاج کی علامت بن چکا ہے۔ قلعہ منگلا صرف ایک تاریخی عمارت نہیں بلکہ یہ اِس خطے کی اجتماعی یادداشت کا حصہ ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ قومیں اپنی تاریخ، تہذیب اور ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھ کر ہی اپنی شناخت برقرار رکھ سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قلعہ منگلا ملکی و غیر ملکی سیاحوں، تاریخ کے طلبہ، محققین اور آثارِ قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے خصوصی کشش رکھتا ہے۔ آج قلعہ منگلا آزاد کشمیر کے اہم سیاحتی مقامات میں شامل ہے۔ منگلا ڈیم کی خوبصورت جھیل، سرسبز پہاڑیاں، پُرسکون ماحول اور تاریخی قلعہ مل کر ایک منفرد منظر پیش کرتے ہیں۔ اگر اِس تاریخی ورثے کی مزید سائنسی بنیادوں پر تحقیق، مؤثر تحفظ اور بہتر تشہیر کی جائے تو یہ نہ صرف قومی تاریخ کے فروغ میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے بلکہ سیاحت اور مقامی معیشت کے لیے بھی بے شمار مواقع پیدا کر سکتا ہے۔

قلعہ منگلا ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ وقت گزر جاتا ہے، سلطنتیں بدل جاتی ہیں، مگر تاریخ اپنے نقوش ہمیشہ زندہ رکھتی ہے۔ اِن نقوش کی حفاظت ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے تاکہ آنے والی نسلیں بھی اپنے ماضی کی عظمت سے آگاہ رہ سکیں۔ قلعہ منگلا آزاد کشمیر کی تاریخ، ثقافت اور عسکری ورثے کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ قلعہ نہ صرف ماضی کی عظمت کا آئینہ دار ہے بلکہ مستقبل کے لیے بھی ایک اہم تاریخی اثاثہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اِس قومی ورثے کی حفاظت کریں، اِس کی تاریخ کو نئی نسل تک پہنچائیں اور اسے قومی شناخت کے ایک روشن باب کے طور پر محفوظ رکھیں۔

بشکریہ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور

pbcaahanghqrs@gmail.com Monthly Ahang

شیخ بدین

ڈیرہ اسماعیل خان کا ایک اہم سیاحتی مقام

تحریر: ہمایوں رحمن

کوہ شیخ بدین جسے مقامی زبان میں غنڈ اور شین غر بھی کہتے ہیں ڈیرہ اسماعیل خان سے پشاور جانے والی شاہراہ پر واقع ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی 4516 فٹ جبکہ اس کے دامن میں واقع درہ پیزو سے چوٹی تک 10 کلومیٹر کا کچہ راستہ ایک گھنٹے کی مسافت کا ہے۔ اس کے جنوب مشرق میں پنیالہ جبکہ مغرب میں ضلع ٹانک واقع ہے۔ شیخ بدین حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا کے نام سے منسوب ہے۔ روایت ہے کہ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا نے تبلیغ اسلام کے سلسلے میں یہاں پر قیام کیا تھا۔ اس طرح بعد میں یہ نام آہستہ آہستہ شیخ بہاؤالدین سے شیخ بدین ہو کر رہ گیا۔

شیخ بدین ڈیرہ اسماعیل خان اور ارد گرد کے گرم علاقوں میں ایک جنت نظیر ٹکڑا ہے کیونکہ ڈیرہ اسماعیل خان اور ملحقہ علاقوں میں گرمیوں میں درجہ حرارت 48 ڈگری تک پہنچ جاتا ہے جبکہ شیخ بدین کی چوٹی پر درجہ حرارت اور موسم معتدل رہتا ہے۔ انگریز دورِ حکومت کے دوران 1860ئ میں اس کو بطور سمر کیمپ منتخب کیا گیا اور 1880ئ میں ترقیاتی کاموں کے بعد اسے باقاعدہ طور پر ضلعی ہیڈ کوارٹر کا درجہ دے کر گرمیوں میں انتظامی مرکز کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا گیا۔ جہاں معاملات کو حل کرنے کیلئے کھلی کچہری لگائی جاتی تھی۔ انگریز افسروں نے اپنی سہولت کیلئے سکواش کورٹ اور چہل قدمی کیلئے چار کلومیٹر کا ایک کچہ راستہ بنوایا۔ جبکہ کئی کمروں پر مشتمل ایک ریسٹ ہاؤس بھی انگریز دورِ حکومت کی داستاں سنا رہا ہے۔ جہاں سے ارد گرد کے حسین نظاروں کا مزہ لیا جا سکتا ہے۔ اس ریسٹ ہاؤس کو ڈاک بنگلہ بھی کہتے ہیں۔ انگریز دور کا تعمیر کردہ پولیس سٹیشن اب بھی بہتر حالت میں موجود ہے۔ یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ پینے کے پانی کا ہے جس کیلئے انگریزوں نے 4 مختلف سائز کے تالاب تعمیر کئے جو ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ یہ انیسویں صدی کے فلٹریشن نظام کا شاہکار ہیں۔ اس میں بارش کا پانی جمع کر کے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں گورا قبرستان اپنی تاریخی اہمیت کے ساتھ موجود ہے جس میں انگریزوں کی قبریں اب بھی موجود ہیں۔

شیخ بدین کی خوبصورتی جنوبی افریقہ کے کیپ ٹاؤن میں موجود پہاڑی اور مری کے بھوربن سے مماثلت رکھتی ہے۔ لیکن چونکہ وہاں پر زندگی کی تمام بنیادی سہولیات موجود ہیں۔ اس لئے سیاحوں کی ایک بڑی تعداد موسمِ گرما میں اُن علاقوں کا رخ کرتی ہے۔ جبکہ شیخ بدین بنیادی سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ سیاحوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں اب تک ناکام رہا ہے۔ حالانکہ موسم کے اعتبار سے شیخ بدین موسم گرما میں علاقے کے سیاحوں کیلئے کم خرچ میں ایک بہترین سیاحتی مقام ثابت ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ محکمہ سیاحت اس پر مناسب توجہ دے اور اس کو بنیادی ضروریات اور سہولیات سے آراستہ کرے۔

شیخ بدین کی ہریالی اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا رہی ہے۔

صوبائی محکمہ جنگلی حیات کے تحت 15540 ہیکٹر اراضی پر پھیلے ہوئے نیشنل پارک میں زیتون، کیکر اور پلوسہ درخت موجود ہیں۔ اس کے علاوہ شیخ بدین کے جنگلات میں جنگلی جانوروں میں چیتا، بھیڑیا اور دیگر جانور پائے جاتے ہیں جن میں چیتا ناپید ہوتا جا رہا ہے۔

شیخ بدین میں 25 سے 30 گھرانے آباد ہیں۔ یہاں کی مقامی آبادی مغل اور پیر گھرانوں پر مشتمل ہے جو کہ یہاں کے مستقل باشندے خیال کئے جاتے ہیں۔ سیاحوں کیلئے بنیادی سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر مقامی لوگ ہی آئے ہوئے سیاحوں کی مہمان نوازی اور خدمت کرتے ہیں

بشکریہ ریڈیو پاکستان ڈیرہ اسماعیل خان

سائنس اور ٹیکنالوجی

- مصنوعی ذہانت اور سائبر سکیورٹی: ڈیجیٹل دور میں عام انسان کا تحفظ
- پتھر کے ہتھیار سے مصنوعی ذہانت تک: انسان کی حفاظت کا بدلتا ہوا سفر

تحریر: پروفیسر ڈاکٹر خالد محمد خان

بنی نوعِ انسان کی تاریخ دراصل ترقی، ضرورت اور تحفظ کی مسلسل جستجو کی تاریخ ہے۔ انسان نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں بدلتے ہوئے حالات، ضروریات اور خطرات کے مطابق نئے ذرائع اور آلات ایجاد کیے۔ یہ سفر عموماً عہدِ حجر ((Stone Age سے شروع ہو کر زرعی اور صنعتی ادوار سے گزرتا ہوا آج انفارمیشن ایج تک پہنچ چکا ہے۔ ہر دور میں انسان کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جان، مال اور وسائل کی حفاظت کے لیے بھی نئے طریقے اختیار کرنا پڑے۔

عہدِ حجر میں انسان نے پتھر اور ہڈیوں کو تراش کر تیز دھار آلات بنائے۔ یہی آلات اُس کے لیے شکار کا ذریعہ بھی تھے اور اپنی حفاظت کا وسیلہ بھی۔ وقت کے ساتھ انسانی ذہانت اور تجربے نے نئی ایجادات کو جنم دیا۔ پہیے کی ایجاد اور پھر مشینوں کی ترقی نے انسانی تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ صنعتی انقلاب نے نہ صرف پیداوار اور معیشت کو تبدیل کیا بلکہ انسانی معاشروں کی ساخت، طرزِ زندگی اور باہمی تعلقات کو بھی ایک نئی شکل دی۔

آج ہم انفارمیشن ایج میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اِس دور کا سب سے قیمتی سرمایہ صرف زمین، سونا یا مشینری نہیں بلکہ معلومات، ڈیٹا اور ڈیجیٹل شناخت بھی ہے۔ انسان اب انٹرنیٹ، موبائل فون اور مختلف مواصلاتی ذرائع کے ذریعے مسلسل ایک دوسرے سے منسلک ہے۔ ایک وقت تھا جب کسی شخص کے گھر کا پتہ اُس کی شناخت اور رابطے کا بنیادی ذریعہ ہوتا تھا، لیکن آج بہت سے معاملات میں اُس کا ای میل ایڈریس، موبائل نمبر اور آن لائن شناخت زیادہ اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ خطوط کی جگہ ای میلز نے لے لی ہے اور روایتی ملاقاتوں اور دفتری رابطوں کی جگہ ڈیجیٹل کمیونیکیشن نے حاصل کر لی ہے۔

اِسی طرح معاشی سرگرمیوں میں بھی ایک بنیادی تبدیلی آچکی ہے۔ ماضی میں بینکنگ کے لیے بینک جانا، چیک لکھنا اور مختلف کاغذی مراحل سے گزرنا ضروری ہوتا تھا، جبکہ آج ایک عام شخص اپنے موبائل فون کے ذریعے بینکنگ ایپلی کیشنز استعمال کرتے ہوئے رقم منتقل کر سکتا ہے، بِل ادا کر سکتا ہے اور متعدد مالی معاملات گھر بیٹھے انجام دے سکتا ہے۔ تعلیم، خریداری، تفریح، مطالعہ اور سماجی رابطے بھی بڑی حد تک ڈیجیٹل دنیا میں منتقل ہو چکے ہیں۔ ہماری پسند، ناپسند اور دلچسپیوں کی بنیاد پر ہمیں کتابیں، فلمیں، ویڈیوز اور دیگر مواد تجویز کیا جاتا ہے۔

گویا انفارمیشن ایج میں انسان کی ایک نئی شناخت وجود میں آچکی ہے، جسے ہم ڈیجیٹل یا ورچوئل شناخت کہہ سکتے ہیں۔ یہ شناخت ہمارے سوشل میڈیا اکاؤنٹس، ای میلز، بینکنگ ایپس، آن لائن سرگرمیوں، تصاویر، رابطوں اور ڈیٹا پر مشتمل ہے۔ آج کے دور میں مکمل طور پر ڈیجیٹل دنیا سے الگ رہنا تقریباً ممکن نہیں رہا۔ جب انسانی زندگی کا اتنا بڑا حصہ ڈیجیٹل ہو گیا ہے تو اِس کی حفاظت بھی ایک بنیادی ضرورت بن گئی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سائبر سکیورٹی کا تصور ہمارے سامنے آتا ہے۔

سائبر سکیورٹی دراصل ہماری ڈیجیٹل شناخت، معلومات، اکاؤنٹس، آلات اور آن لائن زندگی کو غیر مجاز رسائی، چوری، فراڈ اور حملوں سے محفوظ رکھنے کا نام ہے۔ جس طرح ہر دور میں انسان نے اپنے جسمانی وسائل کی حفاظت کے لیے ہتھیار، دیواریں، تالے اور حفاظتی نظام بنائے، اِسی طرح انفارمیشن ایج میں اِسے اپنے ڈیٹا اور ڈیجیٹل وجود کی حفاظت کے لیے سائبر سکیورٹی کی ضرورت ہے۔

تاہم گزشتہ ایک دہائی تک سائبر سکیورٹی کو سمجھنا اور اِس کے مؤثر طریقے اختیار کرنا بڑی حد تک ماہرین اور تکنیکی افراد کا کام سمجھا جاتا تھا۔ ایک عام صارف کو اکثر یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اپنے اکاؤنٹس کو کیسے محفوظ بنایا جائے، کون سی Privacy Settings ضروری ہیں یا کسی مشتبہ سرگرمی کی صورت میں کیا اقدامات کیے جائیں۔ تکنیکی اصطلاحات اور پیچیدہ طریقہ کار عام صارف اور سائبر سکیورٹی کے درمیان ایک فاصلے کا باعث تھے۔

مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) نے اِس صورتحال کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ خصوصاً Generative AI نے معلومات اور مہارت تک رسائی کو عام انسان کے لیے بہت آسان بنا دیا ہے۔ آج ایک عام شخص اپنی زبان میں سوال پوچھ کر فوری اور مرحلہ وار رہنمائی حاصل کر سکتا ہے کہ اپنے سوشل میڈیا اکاؤنٹ کو کیسے محفوظ بنانا ہے، بینکنگ ایپلی کیشنز کی حفاظتی ترتیبات کیا ہونی چاہییں، ای میل اکاؤنٹ کو کیسے محفوظ کیا جائے یا موبائل فون کی Privacy اور Location Settings کو کس طرح بہتر بنایا جائے۔

اِس لحاظ سے AI نے سائبر سکیورٹی کے علم کو ایک حد تک جمہوری (Democratize) کر دیا ہے۔ جو معلومات اور رہنمائی پہلے صرف ماہرین یا تکنیکی افراد تک محدود تھی، اب وہ ایک عام صارف کی دسترس میں آسکتی ہے۔ AI کسی بھی فرد کو اِس کی ضرورت اور فہم کے مطابق سادہ اور مرحلہ وار طریقے سے بتا سکتی ہے کہ اِسے اپنی ڈیجیٹل زندگی کو محفوظ بنانے کے لیے کیا اقدامات کرنے چاہییں۔

لیکن یہاں ایک بنیادی حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے: AI رہنمائی فراہم کر سکتی ہے، مگر احتیاط اور ذمہ دارانہ فیصلہ سازی انسان کو خود کرنی ہو گی۔ سائبر سکیورٹی صرف کسی سافٹ ویئر یا ٹیکنالوجی کا نام نہیں بلکہ ایک طرزِ عمل بھی ہے۔ ایک عام صارف کے لیے چند بنیادی اصول نہایت اہم ہیں۔

سب سے پہلا اصول مضبوط اور منفرد پاس ورڈز کا استعمال ہے۔ ہر اہم اکاؤنٹ کے لیے الگ پاس ورڈ ہونا چاہیے اور ایک ہی پاس ورڈ کو تمام ایپلی کیشنز میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ مضبوط پاس ورڈز کے ساتھ جہاں ممکن ہو وہاں Password Manager کا استعمال بھی مفید ہو سکتا ہے۔ اگر کسی پاس ورڈ کے افشاء یا compromise ہونے کا شبہ ہو تو اسے فوراً تبدیل کرنا چاہیے۔

دوسرا اہم اصول Two-Step Verification یا Multi-Factor Authentication کو فعال کرنا ہے۔ صرف پاس ورڈ پر انحصار کرنا اب کافی نہیں رہا۔ اگر کسی وجہ سے پاس ورڈ کسی دوسرے شخص کے ہاتھ لگ بھی جائے تو اضافی تصدیق کا مرحلہ اکاؤنٹ کو غیر مجاز رسائی سے بچانے میں مدد دیتا ہے۔

تیسرا اور شاید سب سے اہم اصول آن لائن دنیا میں اجنبی شناختوں پر غیر ضروری اعتماد نہ کرنا ہے۔ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز، آن لائن گیمنگ، چیٹ رومز اور دیگر ڈیجیٹل ذرائع میں ہم اکثر ایسے لوگوں سے رابطہ کرتے ہیں جنہیں ہم حقیقی زندگی میں نہیں جانتے۔ Facebook، Instagram اور دیگر پلیٹ فارمز پر کسی شخص کی تصویر، نام، پروفائل یا حتیٰ کہ آواز بھی لازماً اِس کی حقیقی شناخت کی ضمانت نہیں ہوتی۔

دنیا بھر میں ایسے بے شمار واقعات سامنے آچکے ہیں جہاں جعلی شناخت کے ذریعے لوگوں کا اعتماد حاصل کیا گیا، اُن کا ذاتی یا مالی ڈیٹا حاصل کیا گیا اور بعض صورتوں میں متاثرہ افراد کو انتہائی ناخوشگوار نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔ مصنوعی ذہانت اور Deepfake ٹیکنالوجی کے دور میں یہ مسئلہ مزید پیچیدہ ہو گیا ہے کیونکہ جعلی تصاویر، آوازیں اور ویڈیوز پہلے سے کہیں زیادہ حقیقت کے قریب بنائی جا سکتی ہیں۔

اِس لیے ڈیجیٹل دنیا کا ایک بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ ہر آن لائن شناخت کو فوراً قابلِ اعتماد نہ سمجھا جائے۔ خاص طور پر جب کوئی شخص ذاتی معلومات، پاس ورڈ، OTP، بینکنگ تفصیلات یا مالی لین دین سے متعلق معلومات طلب کرے تو انتہائی احتیاط ضروری ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ڈیجیٹل دنیا میں ہر چیز وہ نہیں ہوتی جو بظاہر نظر آتی ہے۔

مصنوعی ذہانت نے ایک طرف سائبر مجرموں کے لیے نئے امکانات پیدا کیے ہیں، مگر دوسری طرف اِس نے عام انسان کو بھی اپنی حفاظت کے لیے غیر معمولی طاقت فراہم کی ہے۔ آج AI ایک ڈیجیٹل معاون کی طرح عام صارف کو سائبر خطرات سمجھنے، حفاظتی اقدامات اختیار کرنے اور اپنی ڈیجیٹل زندگی کو بہتر انداز میں محفوظ بنانے میں مدد دے سکتی ہے۔

انسانی تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ ہر نئی ٹیکنالوجی اپنے ساتھ مواقع بھی لاتی ہے اور خطرات بھی۔ پتھر کے زمانے میں انسان نے اپنے دستیاب وسائل سے ہتھیار بنائے، صنعتی دور میں مشینوں نے دنیا بدل دی، اور آج انفارمیشن ایج میں مصنوعی ذہانت انسانی زندگی کے تقریباً ہر شعبے کو تبدیل کر رہی ہے۔ اب ضرورت اِس بات کی ہے کہ ہم AI کو صرف سہولت اور تفریح کے لیے استعمال نہ کریں بلکہ اِسے اپنی ڈیجیٹل حفاظت اور سائبر سکیورٹی کے لیے بھی ایک مؤثر ذریعہ بنائیں۔

آخر کار، سائبر سکیورٹی صرف ماہرین کی ذمہ داری نہیں بلکہ ہر اُس شخص کی ذمہ داری ہے جو موبائل فون، انٹرنیٹ، ای میل، سوشل میڈیا یا آن لائن بینکنگ استعمال کرتا ہے۔ AI نے اِس ذمہ داری کو سمجھنا اور اِس پر عمل کرنا پہلے سے کہیں آسان بنا دیا ہے۔ اب سوال یہ نہیں کہ ایک عام انسان سائبر سکیورٹی کا ماہر ہے یا نہیں؛ اصل سوال یہ ہے کہ کیا وہ اپنی ڈیجیٹل شناخت اور معلومات کی حفاظت کے لیے دستیاب ذرائع کو ذمہ داری سے استعمال کر رہا ہے؟

مصنف، ایم بی اے کرنے کے بعد کمپیوٹر سائنس میں پی ایچ ڈی اور آرٹیفیشل انٹیلیجنس میں پوسٹ ڈاکٹریٹ کی ڈگری رکھتے ہیں۔ گزشتہ سال سے اعلیٰ تدریس سے وابستہ ہیں۔ اِس وقت کراچی انسٹیٹیوٹ آف اکنامکس اینڈ ٹیکنالوجی میں صدر کے عہدے پر کام کر رہے ہیں۔

بشکریہ پی بی سی کراچی

گلوں میں رنگ بھرے

باغبانی کا شوق رکھنے والے مرغوب احمد عباسی سے خصوصی گفتگو

شریکِ گفتگو:فرخ ناز عینی، میمونہ شمیل حورانی
صوت سے تحریر تک : کلثوم اختر

زندگی کی تیز رفتار شاہراہ پر دوڑتے ہوئے ہم اکثر تھک جاتے ہیں۔ ذرا ، اگر زمین سے ہریالی رخصت ہو جائے، درخت نہ رہیں، پھول مسکراہٹیں نہ بکھیریں، پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی نہ دے، بارش کی رِم جھم اور مٹی کی سوندھی خوشبو نہ ہو تو کیا زندگی پھر بھی اتنی ہی خوبصورت رہے گی؟ یقینا نہیں۔ قدرت نے ہمیں بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ اِن میں درخت اور پودے ایسی خاموش نعمتیں ہیں جو بولے بغیر بھی مسلسل انسانیت کی خدمت کر رہی ہیں۔ جی ہاں، ہم بات کر رہے ہیں شجر کاری اور باغبانی کی یعنی سر سبز زندگی کی۔

شجر کاری دراصل فطرت سے ہمارے تعلق کو مضبوط کرتی ہے۔ اللہ تعالی نے انسان کی فطرت میں خوبصورتی کے لیے محبت رکھ دی ہے۔ ہریالی اور تازگی ہمارے ذہن اور دل پر گہرے مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔ باغبانی شوق کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر دل میں لگن نہ ہو تو پودوں کی نگہداشت کرنا، ان سے رشتہ جوڑنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ باغبانی صرف مٹی میں بیج بونا نہیں، یہ صبر، محبت اور فطرت سے جڑنے کا نام ہے۔

مرغوب احمد عباسی باغبانی کی دنیا کا ایک ایسا نام ہیں جنہیں اِس شعبے کا بے تاج بادشاہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کے تقریباً پچاس برس اِس سر سبز مشن کے لیے وقف کر دیے ہیں۔ جناب مرغوب احمد عباسی کو اسٹوڈیو میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ السلام علیکم !

مرغوب عباسی: وعلیکم السلام !

میمونہ: مرغوب صاحب، آپ کے کریڈٹ پر اتنے کام اور اتنی باتیں ہیں کہ میں اور عینی یہ طے نہیں کر پا رہے تھے کہ آپ سے کیا پوچھیں اور کیا چھوڑ دیں۔ یہ بتایئے گا کہ باغبانی کی اصل روح کیا ہے؟

عینی: مرغوب صاحب، سب سے پہلے یہ بتایئے کہ آپ کے باغبانی کے سفر کا آغاز کیسے ہوا؟

مرغوب عباسی: سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے اِس خوبصورت موضوع پر مدعو کیا۔ باغبانی کا آغاز بچپن ہی سے ہو گیا تھا۔ فطرت سے ایک قدرتی لگاؤ پیدا ہو گیا، خاص طور پر پودوں سے۔ عمر کے جس حصے میں جو ممکن تھا، وہ کرتا رہا۔ شروع میں بس اتنا ہی کر سکتا تھا کہ گھر میں چھوٹے چھوٹے پودے لگا لیتا۔ وہ اُگتے، کبھی ٹوٹ جاتے، کبھی خراب ہو جاتے، تو دوبارہ لگا لیتا۔ خوشی ہوتی، مایوسی بھی، مگر سلسلہ چلتا رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ شوق پختہ ہوتا گیا۔

میمونہ: یعنی آپ کو خوبصورتی سے محبت تھی؟

مرغوب عباسی: جی، مجھے فطرت سے بے حد محبت ہے۔ مادی چیزوں کی طرف کبھی رجحان نہیں رہا۔

میمونہ: پہلا پودا کون سا تھا؟ کچھ یاد ہو تو ضرور بتایئے؟

مرغوب عباسی: درست طور پر یاد نہیں کہ پہلا پودا کون سا تھا۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ گھر میں ایک چھوٹی سی کیاری ہوتی تھی۔ اُس زمانے میں گلِ عباس بہت عام تھا۔ اُس کیاری میں وہی لگایا تھا۔ اُس پر کافی پھول آتے تھے۔ آج کل بھی اُس کا موسم ہے۔ بس وہیں سے آغاز ہوا۔

میمونہ: باغبانی کا یہ سفر تو بہت طویل ہے۔ کیا بچپن میں آپ کے والدین یا بہن بھائیوں کی طرف سے کبھی حوصلہ شکنی ہوئی؟ اکثر ہوتا ہے کہ بچہ پودے لگائے تو بڑے اسے وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ کیا آپ نے بھی جیب خرچ سے ٹافیاں خریدنے کے بجائے پودے خریدے؟

مرغوب عباسی: آپ نے بالکل درست کہا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے والدین کی طرف سے کوئی خاص حوصلہ افزائی حاصل نہیں تھی۔ اُس زمانے میں گھریلو باغبانی کو فضول کام سمجھا جاتا تھا۔ یہی کہا جاتا تھا کہ مٹی اور پودوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ میرا رجحان دوسرے بچوں جیسا نہیں تھا جو کھیل کود میں لگے رہتے ہیں۔

میمونہ: تو بتایئے، کتنے پودے خراب کیے، کتنے لگائے، کتنے سنبھالے؟ ڈانٹ کتنی پڑی؟

مرغوب عباسی: دانستہ طور پر تو کوئی نہیں۔ سچ یہ ہے کہ اوپر سے نگرانی کرنے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ نہ کوئی دیکھتا تھا، نہ کوئی ٹوکتا تھا۔ خود ہی پودے لگاتا، خود ہی توڑ دیتا، کبھی جل بھی جاتے اور پھر خود ہی دوبارہ لگا لیتا۔ بس یوں ہی سیکھتا رہا۔ جو کچھ آج میرے پاس ہے، وہ سب میں نے خود بنایا ہے۔ روف ٹاپ گارڈن بنایا، ورٹیکل گارڈن (vertical Garden) تیار کیا، کچن گارڈننگ بھی کی اور آرنیمینٹل (Ornamental gardening) گارڈننگ بھی۔ باغبانی کے لیے درکار اوزار اور پُرزے بھی خود ہی بناتا ہوں۔ سمجھ لیجیے، یہ مکمل طور پر میرا ہی کام ہے۔

میمونہ: آپ نے اِس شوق کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی زندگی کے پچاس قیمتی سال دیے۔ اِس دوران زندگی میں آپ نے کیا تجربات کیے؟

مرغوب عباسی: وقت کے ساتھ اُتار چڑھاؤ آتا رہا۔ طالبِ علمی کے دنوں میں مصروفیات زیادہ ہوتی تھیں تو باغبانی کو کم وقت دے پاتا تھا۔ جب فراغت ملتی تو زیادہ وقت پودوں کے ساتھ گزرتا۔ اصل تبدیلی ریٹائرمنٹ کے بعد آئی۔ ملازمت کے دوران روزانہ دس بارہ گھنٹے دفتر کی نذر ہو جاتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ سارا وقت مجھے مل گیا۔ تب سے باغبانی فاسٹ ٹریک پر آ گئی۔

میمونہ: کیا کوئی ایسے پودے تھے جنہیں لگاتے ہوئے آپ سوچتے تھے کہ یہ جلدی بڑے ہوں، اِن کا سایہ پرندوں کو ملے، گھر والوں کو فائدہ ہو؟

مرغوب عباسی: دیکھیے، ہر باغبان کی یہی خواہش ہوتی ہے، خواہ پودا جنگلی ہو، خودرو ہو یا آرائشی۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر پودا بڑھے، خوبصورت ہو، اُس پر پھول آئیں۔ اگر پھل دار ہے تو پھل لگے، سبزی ہے تو سبزیاں اُگیں۔ اِسی انتظار میں وقت گزرتا ہے اور پودا پروان چڑھتا جاتا ہے۔ اب تو حالات سب کے سامنے ہیں۔ ماحول کا جو حال ہے، گرمی کی شدت، بارشوں کی بے ترتیبی، یہ سب ہم سب جانتے ہیں۔ ایسے میں ضرورت اِس بات کی ہے کہ ہر شخص کم از کم ایک پودا لگا کر اپنا کردار ادا کرے۔ یہ فطرت سے محبت کا عملی ثبوت ہے۔ کل کو اُسی پودے سے سایہ بھی ملے گا، آکسیجن بھی اور ماحول کی خوبصورتی میں بھی اضافہ ہوگا۔

عینی: آپ کے خیال میں ہماری زندگی میں پودوں کی کتنی اہمیت ہے؟

مرغوب عباسی: میں سمجھتا ہوں کہ پودے ہماری زندگی سے براہِ راست جڑے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی بے کار چیز نہیں۔ اگر ہم اِن کی قدر نہ کریں تو اِس کے نقصانات ہمیں بھگتنے پڑتے ہیں۔ میں نے یورپ کے کئی ممالک دیکھے ہیں جہاں ہر طرف ہریالی ہے، سبزہ ہی سبزہ ہے، ہر وقت بارش اور خوبصورت بادلوں والا موسم رہتا ہے۔ وہاں حکومت کی سطح پر پودوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔

لوگوں کے بیک یارڈز میں جگہ مختص ہوتی ہے، شوق رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اُنہیں چھوٹے چھوٹے پلاٹس دیے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنا شوق پورا کریں۔ پانی کی سہولت بھی فراہم کی جاتی ہے۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ہر گھر کے آگے یا پیچھے ہریالی ہو۔ ہمارے یہاں بدقسمتی سے یہ رجحان نہیں ہے۔ اِس کے باوجود میں اپنی سی کوشش کرتا ہوں۔ مسجد ہو، امام بارگاہ ہو، چرچ ہو یا کوئی کھلا میدان جہاں بھی موقع ملے، ساتھیوں کے ساتھ مل کر شجر کاری کر دیتا ہوں۔

عینی: آپ نے باغبانی اور تربیت کی ورکشاپ بلا معاوضہ رکھی ہوئی ہے۔ اِس کی کیا وجہ ہے؟

مرغوب عباسی: دیکھیے، قرآن و حدیث میں درختوں اور پودوں کا ذکر بہت جگہ آیا ہے۔ اِن کی اہمیت پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ اگر غور کریں تو یہ صدقہ جاریہ ہے۔

عینی: جی، کہا بھی جاتا ہے کہ ایک پودا لگانا پوری انسانیت کو بچانے کے برابر ہے۔

مرغوب عباسی: بالکل درست۔ بلکہ کسی پودے کو بلاوجہ کاٹ دینا بھی ایک طرح کا قتل ہی ہے۔ اِسی لیے ہم اسکول اور کالج کے طلبہ میں شعور اُجاگر کر رہے ہیں کہ وہ دیگر سرگرمیوں سے زیادہ باغبانی کو اہمیت دیں۔ بچوں کو یہ سمجھانا ضروری ہے کہ فطرت کے ساتھ جڑنا خوبصورت عمل ہے۔ کل کو اِسی سے آپ کو آکسیجن ملے گی، پرندے آئیں گے، موسم خوشگوار ہوگا، سایہ میسر آئے گا۔ فائدے بے شمار ہیں۔ اگر گھر میں تھوڑی سی بھی جگہ ہے تو خواتین سبزیاں اُگائیں، کچن گارڈننگ کریں۔

میمونہ: میں چاہوں گی کہ اِس موضوع پر ہم کچھ دیر بعد تفصیل سے بات کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔ ایسے میں کچن گارڈننگ بہت مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ کراچی جیسے شہر میں جہاں فلیٹس اور اپارٹمنٹس زیادہ ہیں، زمین کا ملنا مشکل ہے۔ تو گملوں میں، کم روشنی والی جگہوں پر سبزیاں اور ضروری چیزیں کیسے اگائی جا سکتی ہیں؟

میمونہ: جناب مرغوب صاحب بنیادی طور پر فطرت سے جڑے ہوئے ایک آرٹسٹ ہیں۔ آپ نے بتایا کہ موسیقی سے لگاؤ ہے، اِس بارے میں بتایئے کہ موسیقی کا شوق کیسے پیدا ہوا؟ گٹار کہاں سے سیکھا؟

مرغوب عباسی: وہ نوے کی دہائی کا وقت تھا۔ پاکستان میں پاپ موسیقی کا دور تھا۔ ہم بھی اِس سے متاثر تھے اور پاپ موسیقی کے انسٹرومنٹس کو پسند کرتے تھے۔ اُس وقت جو لوگ گٹار بجاتے تھے، میں نے اُن سے سیکھا۔ گٹار خریدا اور کچھ عرصہ بجایا بھی۔ یہ میرا شوق تھا اور میں کافی اچھا بجا لیتا ہوں۔ اب بھی کبھی کبھی شوق کے تحت بجاتا ہوں۔

مرغوب صاحب، آپ اسکول، کالج، یونیورسٹی میں لیکچرز دیتے ہیں، تربیت دیتے ہیں، اور وہ بھی بغیر کسی معاوضے کے۔ اِس جذبے کے پیچھے کیا سوچ کارفرما ہے؟

*مرغوب عباسی: اصل میں یہ کام، یا یوں کہیے یہ شوق، اتنا خوبصورت ہے کہ آپ کے ہاتھوں مسلسل صدقہ جاریہ ہوتا رہتا ہے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ بچوں کو سکھانے کی کوشش کروں۔ شاید کل کو اِن میں سے کچھ بچے یہ کام آگے بڑھائیں۔ مجھے اِس کا احساس اُس وقت ہوا جب میں نے چند بچوں کو گائیڈ کیا، انہیں پودے دکھائے، سمجھایا۔ اُنہوں نے حیرت انگیز دلچسپی لی۔ ایسا لگا جیسے اُنہیں اِس طرف کبھی کسی نے متوجہ ہی نہیں کیا تھا۔ وہ اتنے شوق سے ہر چیز دیکھ رہے تھے، کر رہے تھے کہ مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

ہمارے ہاں بچوں کی سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم اُنہیں تحفے میں مادی چیزیں دیتے ہیں، سالگرہ پر، الوداعی پارٹیوں میں، اسکول کے پروگراموں میں۔ بہتر ہوگا کہ ہم اُنہیں پودوں کی صورت میں پاٹ گفٹ دیں یعنی گملے۔ اِس سے بچوں میں شوق پیدا ہوتا ہے۔ ہم اُنہیں سکھائیں کہ مٹھائی اور کیک کی جگہ اگر ہم تمہیں ایک خوبصورت پودا دیں تو کیسا رہے گا؟ میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ جب ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا تو سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ جاپانیوں کے ہاں فطرت کی اہمیت بہت ہے تو اُنہیں خیال آیا کہ ہمارے پاس تو کچھ بچا ہی نہیں۔ تب اُنہوں نے ایک طریقہ نکالا جسے کوکوڈاما کہتے ہیں۔ سمجھ لیجیے کہ مٹی کا ایک گولا بنا کر اُس میں پودا لگایا اور اسے لٹکا دیا، کیونکہ اُن کے پاس گملے نہیں تھے۔ یہ طریقہ بہت دیر تک کارآمد رہتا ہے۔

جب میں نے یہ پڑھا اور دیکھا تو میں نے خود بھی بہت سے کوکوڈاما بنائے۔ مجھے خود بہت اچھا لگا۔ کئی لوگوں کو میں نے تحفے کے طور پر دیے اور انہیں بے حد پسند آئے۔ میرا یہی کہنا ہے کہ بچوں کو اِس طرف راغب کرنا چاہیے۔ والدین بھی اور اسکول بھی ہفتے میں آدھا گھنٹہ یا ایک گھنٹہ باغبانی کی تربیت کے لیے مختص کریں۔ سوشل میڈیا، ریڈیو، ٹی وی سب کو شجر کاری کو آگے بڑھانا چاہیے تاکہ لوگوں میں اِس کا شوق پیدا ہو۔

میمونہ: مرغوب صاحب، تربیت کے دوران کیا کوئی ایسی بات ہوئی جو آپ کے طلبہ کو حیران کر گئی ہو؟ کوئی یادگار لمحہ جو آج تک ذہن میں تازہ ہو؟

مرغوب عباسی: کوئی ایک واقعہ تو خاص طور پر یاد نہیں، مگر بچوں کا جوش و خروش ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ اُن کا بس نہیں چلتا کہ ایک ہی دن میں گھر کو سرسبز کر دیں۔ وہ بے چین ہوتے ہیں کہ سب کچھ آج ہی ہو جائے۔ اُنہیں سمجھانا پڑتا ہے کہ باغبانی صبر کا کام ہے۔ یہ راتوں رات نہیں ہوتی۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھائیں۔ ایک دن میں ڈگریاں نہیں مل جاتیں۔ اسکول میں باغبانی کریں، چھت پر پودے لگائیں، کسی خالی پلاٹ کو پودوں سے سرسبز کر دیں یا ورٹیکل گارڈننگ آزمائیں، مگر آغاز ضرور کریں۔

عینی: ہم خواتین اپنے گھروں میں پودے لگانا چاہتی ہیں، مگر سمجھ نہیں آتا کہ کیا غلطی ہو جاتی ہے۔ بازار سے مٹی لاتے ہیں، پودا لگاتے ہیں، پانی بھی دیتے ہیں، روشنی کا بھی خیال رکھتے ہیں، مگر ایک ہفتے بعد پودا مرجھا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

مرغوب عباسی: اِس کی چند بنیادی وجوہات ہیں۔ بیج کا معیاری ہونا، مٹی کا صحیح مرکب، پانی کی مناسب مقدار، دھوپ، موسم یہ سب عوامل اہم ہیں۔ اگر آپ نے اِن باتوں کو سمجھ کر، سیکھ کر اور تحقیق کر کے کام کیا تو نتیجہ ضرور اچھا ملے گا۔ آج کل تو انٹرنیٹ پر ہر معلومات دستیاب ہے۔ اکثر لوگ نرسری سے خوبصورت اور صحت مند پودا خرید کر لاتے ہیں۔ پیسے بھی خرچ کرتے ہیں، محنت بھی، مگر گھر لا کر ایک ہفتے بعد وہ پودا مر جاتا ہے۔ اِس سے دل ٹوٹ جاتا ہے اور مایوسی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم کچھ غلطیاں کرتے ہیں اور کچھ باتوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ نرسری میں کوئی خاص جادو نہیں ہوتا۔ وہاں کی آب و ہوا، کھاد اور مٹی عام سی ہوتی ہے، مگر پودے پھر بھی سرسبز ہوتے ہیں۔ اِسی طرح جنگل میں کون کھاد ڈالتا ہے؟ کون اسپرے کرتا ہے؟ پھر بھی جنگل ہرا بھرا رہتا ہے۔ اِس کی کچھ قدرتی وجوہات ہیں۔ جنگلات میں ہربل پودے ہوتے ہیں۔ مگر بات صرف اُن کی نہیں۔ آپ پورا جنگل دیکھیں، وہ خود بخود ہرا بھرا رہتا ہے۔ وہاں کوئی یوریا نہیں ڈالتا، کوئی اسپرے نہیں کرتا۔ قدرت کا اپنا نظام ہے۔

عینی: تو ایسے کون سے پودے ہیں جو خواتین آسانی سے گھر میں لگا سکیں اور جن کا انتظار بھی نہ کرنا پڑے؟ میں نے خود پیاز اور لہسن لگایا، بہت کوشش کی مگر وہ اُگے ہی نہیں۔

مرغوب عباسی: پیاز اور لہسن سمیت سبزیاں لگائیں تو نتیجہ اچھا ملتا ہے۔ پیاز کے لیے چھوٹی گانٹھیں لگائیں تو جلد ہری پیاز حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر بیج سے لگائیں تو پہلے پنیری نکلتی ہے۔ پھر اُس پنیری کو منتقل کرتے ہیں۔ اوپر ہری پیاز چلتی رہتی ہے اور نیچے گانٹھ بننا شروع ہو جاتی ہے۔ مکمل پیاز تیار ہونے میں سات آٹھ مہینے لگتے ہیں، مگر ہری پیاز ایک مہینے میں مل جاتی ہے۔ اِس کے علاوہ دھنیا اور پودینہ بھی آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔

*عینی: دھنیا اور پودینہ کیسے آسانی سے لگایا جاسکتا ہے؟

مرغوب عباسی: دھنیا کے ساتھ بھی کچھ باریکیاں ہیں۔ بیج کتنا پرانا ہے، اِس پر کوئی اسپرے ہوا تھا یا نہیں، اُسے گرمی میں رکھا گیا تھا یا ٹھنڈک میں، یہ سب باتیں اثر ڈالتی ہیں۔ ہمیں اکثر اِن کا علم نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے آپ تین سے پانچ خالی گملے رکھیں۔ ایک دم سے ہریالی نہیں آتی۔ اِن ڈور اور آؤٹ ڈور پودوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اِن ڈور پودوں کو تیز دھوپ نہیں چاہیے۔ زیادہ دھوپ ملے تو وہ جل جاتے ہیں۔ آؤٹ ڈور پودوں کو سات آٹھ گھنٹے دھوپ درکار ہوتی ہے۔ کچھ پودے سیمی شیڈ ہوتے ہیں، یعنی انہیں ہلکی دھوپ اور سایہ دونوں چاہیے۔ آپ چار پانچ گملے لیں، مٹی اور کھاد کا متوازن آمیزہ تیار کریں۔ شروع میں بازار سے بنی بنائی مٹی لے لیں تو بہتر ہے۔ کچی یا ٹھنڈی کھاد براہِ راست استعمال کریں گی تو پودا جل سکتا ہے کیونکہ اِس میں نائٹروجن اور کچھ گیسیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔

عینی: کچھ لوگ آکسیجن پلانٹس کا ذکر کرتے ہیں۔ اِس سے کیا مراد ہے؟

مرغوب عباسی: تمام پودے دن کے وقت آکسیجن خارج کرتے ہیں، رات کو اُن کا عمل بدل جاتا ہے۔ لیکن کچھ پودے ایسے ہیں جو چوبیس گھنٹے آکسیجن دیتے ہیں، جیسے نیم، پیپل، برگد اور سکھ چین۔ مگر یہ بڑے درخت ہیں، گھر کے اندر نہیں لگائے جا سکتے۔

عینی: جی، آج کل تو واقعی آکسیجن کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

مرغوب عباسی: بالکل۔ آپ نے سنا ہوگا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔ دوا لے رہے ہیں، مگر باہر نکلتے ہی طبیعت بحال ہو جاتی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے کمروں میں آکسیجن کی سطح کم ہو جاتی ہے، خاص طور پر جب گھر بالکل بند ہو، نہ دھوپ آئے نہ تازہ ہوا۔ اگر گھر مکمل طور پر بند ہو، ہوا اور روشنی کا گزر نہ ہو تو اِس کا اثر صحت پر ضرور پڑتا ہے۔

عینی: پودوں میں اکثر کیڑے لگ جاتے ہیں، اِس کا کیا حل ہے؟

مرغوب عباسی: اگر آپ صفائی کا خیال رکھیں تو کیڑوں کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ مارکیٹ میں کئی آرگینک اسپرے دستیاب ہیں، وہ استعمال کریں تو پریشانی نہیں ہوتی۔ میرے گھر میں تو چیونٹی تک نہیں ہے، کوئی کیڑا نہیں آتا۔ مجھے خود کچھ چیزوں سے الرجی ہے، اگر کیڑے آجائیں تو میں مٹی کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ مگر الحمدللہ میرے ہاں یہ مسئلہ نہیں۔ میں اِس کا خاص خیال رکھتا ہوں۔ میں نیم کے تیل یا نیم کے پتوں کا استعمال کرتا ہوں، خاص طور پر مٹی میں۔ جب مٹی کا ذائقہ کڑوا ہو جاتا ہے تو کیڑے قریب نہیں آتے۔ جب اُنہیں کھٹی مٹی ملتی ہے تو وہ دوبارہ پلٹ کر نہیں آتے۔

میمونہ: کھاد بھی تو بہت مہنگی ہو گئی ہے۔ پودوں کا شوق رکھنے والوں کو بتایئے کہ سستی کھاد گھر میں کیسے بنائی جائے؟

مرغوب عباسی: میں تقریباً پینتیس سال سے اپنے گھر میں کھاد بنا رہا ہوں۔ شروع میں تو مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اِسے کیا کہتے ہیں۔ بس بڑے بزرگوں سے سنا تھا کہ کیاری میں پتے پڑے رہنے دو۔ پہلے بات سمجھ نہیں آتی تھی، مگر آہستہ آہستہ میں نے پتوں اور کچن کے فضلے کو جمع کرنا شروع کیا۔ آج لوگ اِسے کاروبار بنا چکے ہیں۔ اِسے کچن کمپوسٹ یا آرگینک کمپوسٹ کہتے ہیں۔ میں خود گھر میں بناتا ہوں اور میرے پاس وافر مقدار میں تیار ہو جاتی ہے۔

میمونہ: جیسے آم کے چھلکے، تربوز کے چھلکے چھوٹے شہروں میں تو یہ جانور کھا لیتے ہیں، مگر کراچی جیسے بڑے شہروں میں یہ سہولت نہیں۔ تو کیا کریں؟ کوئی بڑا ڈبہ لیں اور اُس میں چھلکے ڈالتے جائیں؟

مرغوب عباسی: جی بالکل۔ اِس کا آسان طریقہ یہی ہے۔ میں جب یہ بناتا رہا تو مجھے اندازہ ہوا۔

پچھلے پانچ چھ سال سے دنیا اسے بلیک گولڈ کہتی ہے۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ تین یا چار فٹ گہرا گڑھا کھودیں اور اِس میں کچرا ڈال دیں۔ بقرِ عید پر کتنا نامیاتی مواد ضائع ہوتا ہے، کاش ہم اُسے محفوظ کر لیں۔ محلے کی سطح پر جمع کریں اور شوقین لوگوں کو دے دیں۔ میں تو گھر پر ہی کمپوسٹ بناتا ہوں اور پینتیس چالیس سال سے بنا رہا ہوں۔ اگر آپ میری تیار کردہ کھاد دیکھیں، ابھی دکھا نہیں سکتا مگر تصویروں میں دکھا سکتا ہوں، تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کتنی عمدہ ہوتی ہے، اور مکمل طور پر گھر کی بنی ہوئی۔

عینی: تو کیا آپ نے کبھی اسے بیچنے کا سوچا؟

مرغوب عباسی: نہیں، میری ساری کھاد اپنی ہی گارڈننگ میں استعمال ہو جاتی ہے۔

مرغوب صاحب، آپ کی شخصیت کا ایک کمال یہ بھی سامنے آیا ہے کہ آپ تولئے سے بہت خوبصورت گملے بناتے ہیں۔ اِس وقت ہماری میز پر اِن کا بنایا ہوا ایک سنہری رنگ کا گملا موجود ہے جو گولڈن اور سلور مکس لگ رہا ہے۔

عینی: مجھے تو پہلی نظر میں لگا کہ یہ سونے کا بنا ہے۔

میمونہ: جی بالکل، دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اِس کی بنیاد ایک عام تولیہ ہے۔ تو مرغوب صاحب، یہ آئیڈیا آپ کو کہاں سے آیا؟ اور اب تک کس کس طرح کے گملے بنا چکے ہیں؟

مرغوب عباسی: یہ تقریباً سات آٹھ سال پرانی بات ہے، غالباً رمضان کے دن تھے۔ نہ جانے کیسے، کہیں دیکھا ہوگا، وہیں سے شروعات کی۔ جب پہلا گملہ بنایا اور اُس میں پودا لگایا تو دیکھا کہ پانچ چھ سال تک چلتا رہا۔ یہ بہت مضبوط ہوتے ہیں، بالکل مٹی کے گملے کی طرح۔ تولیے کا بنا ہوا ہے، اِس کا گمان تک نہیں ہوتا۔ نہ نرم رہتا ہے نہ کچا، بلکہ پختہ اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

عینی: کہیں آپ کا تعلق آرٹ گیلری سے تو نہیں؟

مرغوب عباسی: نہیں، یہ سب فطری طور پر ہوا۔ میں بناتا گیا اور اب اپنے ذہن سے نئی شکلیں تخلیق کرتا ہوں۔ کبھی کون کی شکل میں، کبھی مربع، کبھی گول، کبھی گلدان کی صورت میں بنا لیتا ہوں۔

عینی: کوئی خواب میں آکر تو نہیں کہہ گیا تھا کہ ایسے بنا؟

مرغوب عباسی: نہیں، کوئی نہیں کہتا۔ بیٹھے بیٹھے انسان مصور بن جاتا ہے، شاعر بن جاتا ہے۔ خیالات آتے ہیں۔ اگر دماغ میں فضول باتیں، لڑائی جھگڑے آئیں تو اِس سے بہتر ہے کہ کچھ تخلیقی کام کر لیا جائے۔ بے کار چیزوں کو کارآمد بنایا جائے، خوبصورت چیزیں بنائیں، گھر سجائیں۔ انسان مصروف بھی رہتا ہے اور خوش بھی۔

میمونہ: تو آپ کے دوست احباب بہت خوش رہتے ہوں گے، اُنہیں تو خوب تحفے ملتے ہوں گے۔

مرغوب عباسی: بانٹنے سے کمی نہیں ہوتی۔ سب کہتے ہیں کہ اُسے بیچیں، مگر میرا دل نہیں مانتا۔

مجھے بیچنا اچھا نہیں لگتا۔

میمونہ: ایک گملے کو بنانے میں کتنا وقت لگتا ہے؟

مرغوب عباسی: چونکہ یہ ہاتھ کا کام ہے، کوئی سانچہ نہیں ہے، اِس لیے ذہن اور ہاتھ دونوں چلتے ہیں۔ جو شکل ذہن میں ہوتی ہے اُسے ہاتھ سے بناتے ہیں۔ ایک پاٹ تیار کرنے میں تقریباً ایک ہفتہ لگ جاتا ہے۔

عینی: آپ کو گملے بنانے میں زیادہ مزہ آتا ہے یا باغبانی میں؟

مرغوب عباسی: یہ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ میں جب بازار جاتا ہوں تو وہاں کے گملے مجھے پسند نہیں آتے۔ جو پلاسٹک کے یا آئل پینٹ والے ملتے ہیں، میرے نزدیک وہ صفر ہیں کیونکہ اُن میں پودے کو آکسیجن نہیں ملتی۔

عینی: اور یہ جو ماربل والے پاٹس آرہے ہیں، اِن کے بارے میں کیا خیال ہے؟

مرغوب عباسی: ماربل یا پلاسٹک کے گملوں میں اکثر کائی جم جاتی ہے۔ وہ کائی پودے کی جڑوں تک پہنچ کر اسے نقصان دیتی ہے اور کچھ عرصے بعد پودا ختم ہو جاتا ہے۔ سب سے بہتر مٹی کا گملا ہے۔ یہ سب سے پرانا اور آزمودہ طریقہ ہے۔ اِس میں ہوا کی آمد و رفت اچھی رہتی ہے، یعنی وینٹی لیشن بہتر ہوتی ہے۔ میں نے ایک بار بہت اچھا گملا بنایا تھا، میں خود اُس کی تعریف کر رہا ہوں، لیکن سچ یہ ہے کہ میں خود حیران رہ گیا۔ وہ تین فٹ بڑا گملا تھا اور میں نے اُسی پر ایک درخت بنا دیا۔ تنا اور شاخیں اِس طرح بنائیں کہ بالکل اصلی درخت لگ رہا تھا۔

*میمونہ: واقعی، تخلیق کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں نا، اسکائی از دا لمٹ۔ آج واقعی ہمارا گلدستہ عباسی صاحب کی باتوں سے مہک اٹھا ہے، اور ہر طرف پھول جگمگا رہے ہیں۔

مرغوب صاحب، پروگرام کے اختتام پر آپ ہمارے سامعین کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟ میں چاہتی ہوں کہ آج سننے والا ہر شخص شجرکاری کی طرف راغب ہو۔ یہ وقت کی اہم ضرورت ہے، ماحول کی ضرورت ہے، آلودگی اور موسمیاتی تبدیلیوں سے نمٹنے میں درخت بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ تو آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

مرغوب عباسی: میں یہی کہنا چاہوں گا کہ انسان میں انسانیت ضرور ہونی چاہیے۔ اور ہریالی کے حوالے سے ہر شخص کو چاہیے کہ کم از کم ایک پودا ضرور لگائے اور اُس کی حفاظت کرے۔ یقیناً کل اُسے خوشی ہوگی کہ یہ درخت میں نے لگایا تھا، آج اِس پر پھل ہیں، پھول ہیں۔ بچوں کو اِس طرف راغب کریں، اُنہیں سکھائیں۔ اُنہیں گفٹ میں پودے دینا سکھائیں۔ چاہے باجرہ ہی لگا دیں، تین چار دن میں جب وہ پھوٹے گا تو بچے خوش ہوں گے، اُن میں شوق پیدا ہوگا۔ ہریالی کی طرف آئیں، اپنا ماحول بہتر کریں۔ دیکھیں گرمی کا ہر سال بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ اپنا کردار ادا کرے۔ باغبانی اور شجرکاری بہت ضروری ہے۔ یہ گھر گھر ہونی چاہیے۔ سوشل میڈیا کو چاہیے کہ اس پر زیادہ سے زیادہ کام کرے اور اِسے آگے بڑھائے۔

میمونہ: جاتے جاتے میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ اس پچاس سالہ سفر میں ضرور کوئی ایسی ہستی ہوگی، دوستوں یا عزیز رشتے داروں میں، جنھوں نے آپ کو سراہا ہو۔ کیونکہ حوصلہ افزائی آگے بڑھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ کسی ایک کا نام لینا چاہیں تو بتایئے، اور اُنہیں کچھ کہنا چاہیں تو اِس مائیک پر کہہ دیجیے۔

مرغوب عباسی: کوئی ایک نام لینا مشکل ہے۔ کام کرنے والے کم ہوتے ہیں مگر کام ہو جانے کے بعد سراہنے والوں کی تعداد شمار نہیں کی جاسکتی۔ بہت بڑی تعداد ہے جو پسند کرتی ہے، دعائیں دیتی ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ کام کرنے والوں کو معلومات نہیں ہوتیں، اِس لیے وہ کر نہیں پاتے، لیکن ہونے کے بعد سب پسند کرتے ہیں۔

میمونہ: مرغوب صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ تشریف لائے۔

*مرغوب عباسی: مجھے مدعو کرنے کا بہت شکریہ۔

*میمونہ: بہت شکریہ، اللہ حافظ۔

(پی بی سی کراچی کے پروگرام "گلدستہ" میں نشر کیا گیا)

جنگل کا شہزادہ

تحریر: تاج الدین تاجور

آج دارالحکومت کے پرائم ہال میں اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے برائے ماحولیات کی ایک پُر وقار تقریب میں جب میزبان نے جیسے ہی "جنگل کا شہزادہ" کہا تو پورا ہال حاضرین کی تالیوں سے گونج اٹھا، تب باوقار انداز میں کاشف منچ کی طرف بڑھا اور مہمانِ خصوصی سے شیلڈ اور پانچ لاکھ روپے کا چیک وصول کیا۔

اِس کہانی کا آغاز آج سے تقریباً پانچ برس پہلے ہوتا ہے جب کاشف پانچویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ اُس دن اُردو کی کتاب میں ایک مضمون "درخت ہمارے ساتھی" پڑھائی جانی تھی۔ سر احمد کلاس ماسٹر ہونے کے ساتھ اُردو بھی پڑھاتے تھے۔ نہایت قابل، ہمدرد اور شفیق اُستاد سر احمد نے اُس دن حاضری، رجسٹر درج کرنے کے بعد پوری کلاس پر نظر دوڑائی اور پوچھا کہ آج کیا پڑھنا ہے؟ کئی ایک طلباء نے ایک ساتھ کہا "درخت ہمارے ساتھی"۔ سر احمد نے کہا کہ یہ نہایت اہم مضمون ہے جس کا براہِ راست تعلق ہماری زندگی سے ہے۔ اُنہوں نے کاشف سے کہا کہ بیٹا کھڑے ہو کر اِس مضمون کو پڑھنا شروع کیجیے۔ کاشف نے پڑھنا شروع کیا اور سر احمد مشکل الفاظ کے ساتھ ساتھ جملوں کی وضاحت بھی کرتے رہے۔ ڈیڑھ صفحے کے اِس مضمون کے اختتام پر سر احمد نے پودوں، جڑی بوٹیوں، درختوں اور جنگلات کی اہمیت کے بارے میں بتانا شروع کیا کہ کس طرح سے پودے اور جنگل ہماری زندگی میں کردار ادا کرتے ہیں اور کس طرح سے پودے اور جنگل ہماری زندگی کے لیے مفید اور اہم ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم اِن درختوں سے سوختنی لکڑی، عمارتی لکڑی، دوائیوں کا خام مال اور دیگر بہت کچھ حاصل کرتے ہیں بلکہ یہ درخت اور جنگل ہماری جان ہیں۔ یہ ہمیں آکسیجن فراہم کرتے ہیں جو ہماری زندگی کے لیے نہایت اہم ہے، اگر آکسیجن نہ ہو تو انسانی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ درخت نہ صرف زمین کا زیور ہیں بلکہ یہ زمین کی ضامن بھی ہے۔ درخت زمین کے کٹاؤ کو روکتے ہیں اور زمین کو بنجر نہیں ہونے دیتے۔ آخر میں اُنہوں نے کہا آج کل ویسے بھی درخت لگانے کا موسم ہے تو کیوں نہ پیر کے دن ہر بچہ ایک ایک پودا نرسری سے خرید کر لائے جسے ہم سب اسکول کے احاطے میں لگا دیں گے اور پھر انشاءاللہ اُس کی دیکھ بھال بھی کریں گے۔ اُنہوں نے کہا کہ پودا لگانا آسان ہے لیکن اُس کی دیکھ بھال زیادہ ضروری ہے۔ سر احمد نے یہ بھی بتایا کہ ہمارے ملک میں پودے انتہائی سستے ہیں۔ پانچ دس روپے میں اچھا پودا نرسری سے مل جاتا ہے۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ عربی زبان میں پودوں اور درختوں کو شجر کہتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں پودے لگانے کے عمل کو شجر کاری کہتے ہیں۔

کاشف نے شام کو اپنے والد صاحب سے کہا کہ پرسوں ہمارے سکول میں شجر کاری ہے اور ہم سب ایک ایک پودا ساتھ لے جائیں گے۔ کاشف کے والد نے کہا یہ تو بہت اچھا اور نیک عمل ہے۔ ہمارے نبی ﷺ نے درخت لگانے کا حکم دیا ہے۔ چلو کل ویسے بھی اتوار کی چھٹی ہم دونوں نرسری چلے جائیں گے اور وہاں سے ایک نہیں دو پودے خرید لے لیں گے ایک آپ کی طرف سے اور ایک میری طرف سے اور پرسوں صبح دونوں پودے لے کر اسکول چلے جانا۔ کاشف کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پیر کی صبح تیار ہو کر جب کاشف اسکول جانے لگا تو والد صاحب نے کہا کہ بیٹا پودے بڑے نازک ہوتے ہیں سنبھال کے لے جانا اور احمد صاحب کو میرا اسلام بھی کہنا۔ کاشف جب اسکول پہنچ کر کلاس روم میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ تقریباً ہر طالب علم کے ہاتھ یا ڈیسک پر پودے پڑے ہیں۔ سب ہی بہت خوش تھے۔ اسمبلی ہونے کے بعد جب بچے کلاس روم واپس آگئے تو چند لمحوں کے سر احمد بھی تشریف لے ائے۔ آتے ہی اُنہوں نے پوچھا کہ کیا آپ لوگ شجر کاری کے لیے تیار ہیں؟ اور کیا سب بچے پودے لے آئے ہیں؟ جی سر ہم تیار ہیں، پودے بھی حاضر ہیں۔

یوں سب بچے اپنے اپنے پودوں کے ساتھ سر احمد کی رہنمائی میں اسکول کے احاطے آ گئے۔ اسکول کا مالی اور چوکیدار بھی وہیں بیلچے، کدال، پاؤڑے اور پھوارے کے ساتھ موجود تھے۔ سر احمد نے نہ صرف یہ سب انتظام کیا تھا بلکہ اپنی طرف سے بھی بیس پودے لائے تھے۔۔۔۔۔ سب لڑکے، مالی، چوکیدار اور خود سر احمد کدائی، پودے لگانے اور پانی دینے مصروف ہو گئے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد جب سب فارغ ہوئے تو سر احمد نے سب طالب علموں کو شاباش دی اور کہا "اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ ہر صبح آپ لوگ اِن پودوں کو پانی دو گے "سب نے خوشی سے کہا جی سر۔۔۔!

شجر کاری کی یہ مہم کاشف کو اتنی اچھی لگی کہ اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ پورے گاؤں کو گل و گلزار اور سر سبز و شاداب بنائے گا۔ اگلے ہفتے اُس نے جیب خرچ سے اتنی رقم بچائی کہ اتوار کے دن اُس نے قریبی نرسری سے پانچ پودے خریدے اور اپنے گھر کے چھوٹے سے احاطے میں لگا دیئے۔ پھر تو گویا پودے لگانا ہی اُس کا مشغلہ بن گیا، اپنی تعلیم پر توجہ دینے کے ساتھ گویا کاشف کو پودوں اور پودے لگانے سے محبت ہو گئی۔ کاشف تقریباً ہر اتوار کو والد کے ساتھ یا اُن سے اجازت لے کر نرسری جاتا، پودے خریدتا اور گاؤں کے مناسب مقامات پر لگاتا، ہر شام پلاسٹک کی بوتلوں میں پانی بھر کے اپنے لگائے ہوئے پودوں کو پانی دیتا۔ نرسری کا مالک بھی نہایت شفیق بزرگ حاجی صاحب تھے، اُسے بھی پودوں سے عشق تھا، وہ کاشف کو بتاتا کہ کونسا پودا کس زمین میں اور کس موسم میں لگانا چاہیے اور کتنا پانی دینا چاہیے۔ اگلے دو برسوں میں کاشف نے گاؤں کے مختلف مقامات پر ڈیڑھ ہزار کے قریب پودے لگائے تھے جس میں حاجی صاحب نے دو سو اور کاشف کے والد نے ڈھائی سو پودے بطور تحفہ دیئے تھے۔ باقی سب کے سب کاشف نے اپنے جیب خرچ میں بچت کر خریدے اور لگائے تھے۔

کاشف جگہ جگہ پودے لگا رہا تھا اور روزانہ کبھی ایک جگہ اور کبھی دوسری جگہ پودوں کو پانی دیتے نظر آتا تھا۔ پودے لگانے اور پانی دینے میں کبھی کبھی اُس کے تین دوست بھی شامل ہو جاتے۔ کاشف کی محنت رنگ لا رہی تھی اور گاؤں بھر میں اِس کے کام کے چرچے تھے کہ ایک چھوٹا سا لڑکا کتنا بڑا کام کر رہا ہے۔ کاشف کے گاؤں کے باہر ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جو تقریباً بنجر ہی تھی، کاشف روزانہ اسکول آتے جاتے اُس پہاڑی کو دیکھتا۔ ایک دن اُس کے دل میں خیال آیا کیوں نہ بنجر پہاڑی پر ایک چھوٹا سا جنگل لگا کر اُسے سر سبز و شاداب بنا دیا جائے۔ شام کو کاشف نے یہ بات اپنے والد سے کی۔ کاشف کے والد نے کہا کہ بیٹا اس میں کئی مشکلات ہیں، ایک تو یہ کہ یہ پورے گاؤں کی شاملات ہے اور دوسرا یہ کہ اُس پہاڑی کے لیے کم از کم تین چار ہزار پودوں کی ضرورت ہو گی، تیسرے یہ کہ اتنی تعداد میں پودے کون لگائے گا اور پیسے کہاں سے آئیں گے؟ اور بعد میں اُس کی رکھوالی کا بھی مسئلہ ہے۔ والد صاحب کی باتیں سُن کر کاشف تھوڑا مایوس ہوا لیکن اگلے دن جب وہ اسکول جاتے پہاڑی کے قریب سے گزرنے لگا تو اُس کی خواہش مزید تیز تر ہوتی گئی، اس نے سوچا کیوں نہ سر احمد سے بات کی جائے۔ سر احمد اب نہ اُن کے کلاس ماسٹر تھے اور نہ اُن کی کلاس کو اُردو پڑھاتے تھے لیکن کاشف نے ارادہ کر لیا تھا کہ سر احمد سے ضرور بات کرے گا۔ لہٰذا جب چوتھے پیریڈ کے بعد وقفہ ہوا تو کاشف ڈرتے ڈرتے اسٹاف روم کی طرف چلا اور اسٹاف روم کے دروازے پر اندر آنے کی اجازت مانگی۔ اُس وقت اسٹاف روم میں سر احمد کے ساتھ دو اور ٹیچر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ کاشف نے سر احمد سے کہا "سر! آپ سے بات کرنی ہے۔"

جی بیٹا کیا بات ہے؟

سر!۔۔۔۔۔۔ اور پھر کاشف نے ساری بات بتا دی۔

احمد صاحب کچھ دیر خاموش رہے اور پھر دھیرے سے کہا "آئیڈیا اچھا ہے لیکن بہت مشکل،،،،،، لیکن کچھ کرتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ ایسا کرتے ہیں پہلے تو بچوں کی ایک ٹیم بناتے ہیں اور تم اُس کے لیڈر ہو گے، دوسرا اہم کام۔ گاؤں کے جامع مسجد کے خطیب مولانا کریم احمد صاحب سے بات کرتے ہیں ہو کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔ آپ کے والد بھی ساتھ ہوں گے۔ کام مشکل ہے، لوگ بھی روڑے اٹکاتے ہیں اور پھر پیسہ بھی چاہیے، پودے خریدنا ہوں گے، کدائی کے لیے مزدور درکار

ہوں گے پودوں کو پانی دینے کا کوئی نہ کوئی بندوست بھی کرنا ہو گا، پودوں کو بچانے کے لئے باڑ بھی لگانا ہو گی۔ بہت مشکل۔۔۔ کچھ کرتے ہیں۔ کل پہلے ایک ٹیم بناتے ہیں پھر مولانا صاحب سے ملاقات کا بندوست کرتے ہیں۔ مولانا صاحب اچھے آدمی ہیں، مایوس نہیں کریں گے۔"

اگلے دن احمد صاحب نے کاشف کی جماعت سے پانچ بچوں کا انتخاب کیا تاکہ ایک اچھی ٹیم بن سکے۔ پھر جمعرات کے دن بچوں کو لے کر جامع مسجد کے خطیب مولانا کریم احمد کے پاس چلے گئے۔ کاشف کے والد صاحب بھی ہمراہ تھے۔ مولانا نے سب کو خوش آمدید کہا اور آنے کا مقصد پوچھا۔ احمد صاحب نے پورا قصہ سنایا اور کہا یہ آئیڈیا اِس بچے کاشف کا ہے اور یہ باقی دوست اِس کے ہمکار ہوں گے۔ مولانا صاحب بہت خوش ہوئے اور کہا کہ یہ تو بہت نیک خیال ہے بلکہ صدقہ جاریہ ہے۔ میں خود بھی تعاون کروں گا اور کل جمعہ کی نماز سے قبل اِس موضوع پر بات بھی کروں گا کہ گاؤں والے نہ صرف یہ کہ اِس پہاڑی پر شجر کاری پر اعتراض نہ کریں بلکہ ہر شخص مالی تعاون کے ساتھ ساتھ عملی تعاون بھی کرے۔ اگلے دن مولانا کریم صاحب نے جمعے کی تقریر میں بڑی شاندار باتیں کیں اور لوگوں کو اِن بچوں اور خاص کر کاشف سے تعاون پر آمادہ کیا۔ اگلے پانچ دنوں میں اُن بچوں نے کاشف کی سرکردگی میں گھر گھر اور تمام بازار میں چندہ جمع کرنے کے لیے سخت محنت کی۔ مولانا صاحب سمیت پورے گاؤں نے اپنی استطاعت کے مطابق دل کھول کر چندہ دیا اور چار لاکھ سے زیادہ رقم جمع ہو گئی جس کا اعلان مولانا صاحب نے اگلے جمعہ کی تقریر میں کیا کہ اتنی رقم جمع ہو گئی اور یہ احمد صاحب کے پاس ہو گی۔ ایک بزرگ خاتون نے پانی کی موٹر خریدنے کا وعدہ کیا۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ دو مہینے کے بعد مون سون اور شجر کاری کے دن شروع ہونے والے تھے۔ احمد صاحب اور کاشف کے والد کے تعاون اور ہدایات کے مطابق کاشف اور اُس کی ٹیم نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ اُن لوگوں نے پودے خریدے،، موٹر پمپ لگایا، مزدوروں کے ساتھ مل کر پودے لگائے اور حفاظت کے لئے چوکیدار رکھ لیا۔ کاشف اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ بلاناغہ ہر شام پودوں کو دیکھنے چلا جاتا۔ کبھی ساتھیوں کے ساتھ اور کبھی اکیلے۔ تین برسوں ہی میں پودے انسانی قد کے برابر ہو گئے تھے۔ پوری پہاڑی سر سبز ہو گئی تھی بلکہ ایک اچھا خاصا چھوٹا جنگل بن گیا تھا۔۔۔ اور اب گاؤں والے اور اُس کے اسکول کے دوست کاشف کو اُس کی محنت اور پودوں سے عشق کی بناء پر "جنگل کا شہزادہ" پکارنے لگے۔ اُنہی دنوں خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک دن ایک ٹیلی ویژن کے رپورٹر کو کسی نے کاشف اور اُس کے جنگل کے بارے میں خبر دی، بس پھر کیا تھا رپورٹر گاؤں آیا، جنگل دیکھا اور کاشف کا انٹرویو کیا اور جیسے ہی یہ انٹرویو اُس چینل سے نشر ہوا تو گویا پورا ملک کاشف اور اُس کے کارنامے سے باخبر ہوا۔ اگرچہ اِس پوری مہم میں کاشف کے والد اور سر احمد کا بھی بہت بڑا کردار تھا لیکن اصل میں یہ کاشف کا پودوں اور درختوں سے جنون اور عشق ہی تھا کہ آج ایسا جنگل بنتا نظر آ رہا ہے۔ اور آج دار لحکومت کے پرائم ہال میں اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے برائے ماحولیات کی جانب سے ایک پُر وقار تقریب میں کاشف بطور مہمان موجود ہیں۔ میزبان نے جیسے ہی "جنگل کا شہزادہ" کہا تو پورا ہال حاضرین کی تالیوں سے گونج اُٹھا۔ تب باوقار انداز میں کاشف منچ کی طرف بڑھا اور مہمانِ خصوصی سے شیلڈ اور پانچ لاکھ روپے کا چیک وصول کیا اور اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ میں اپنا مشن جاری رکھوں گا اور کوشش کروں گا کہ زیادہ سے زیادہ درخت لگاتا رہوں تاکہ ہمارا یہ پیارا وطن سر سبز اور گل و گلزار بن سکے۔

بشکریہ پی بی سی پشاور